

بنگلادیش میں اردو تنقید و تحقیق کی پہلی تصنیف

بنگلہ میں غالب شناسی

پروفیسر کلیم ہسرامی

سائے اشاعت	یکم نومبر ۱۹۹۹ء
مکتابت	قاسم انیس، ڈھاکہ
مطبع	برقی آرٹ پریس، پٹوالوی، ڈھاکہ
قیمت	چالیس روپے : جنگلادیش
	چالیس روپے : ہندوپاک
	۴ امریکی ڈالر: دوسرے ممالک

تقسیم کار:

- کلچرل اکیڈمی (شاخ) عکس نور میسور روڈ، کھٹا (جنگلادیش)
- بک اینڈ ریجم، سبزی باغ، پٹنہ عکس (ہندوستان)
- نصرت پبلشرز، امین آباد پارک، لکھنؤ (//)
- انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راولپنڈی، دہلی (//)
- انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی (پاکستان)
- منصور بک ہاؤس عکس کچری روڈ، لاہور (//)

کلچرل اکیڈمی

عکس، اقبال روڈ، محمد نواز ڈھاکہ-۷
جنگلادیش

انتساب

استادِ محترم ڈاکٹر عنید لیب شادانی

کے نام !

کلیم سہسرامی

پیش لفظ

زیر نظر مجموعہ بظاہر مختصر ہے لیکن پورے ہنگال کی دنیائے ادب کو اپنے دامن میں سیٹھے ہوئے ہے۔ اس میں یہ پانچ مقالے شامل ہیں:

(۱) ہنگال میں غالب شناسی (۲) غالب کے ایک حریف (۳) غالب کے ایک ہنگالی شاگرد (۴) کلام غالب کے ہنگلا تراجم (۵) غالب کے فکر و فن کا تجزیہ۔ پہلا مقالہ غیر مطبوعہ ہے۔ یہ تمام مقالے ایک ہی سلسلے کی کردی ہیں۔ ان میں موضوع اور معنی کے لحاظ سے بھی باہمی ربط ہے، اس لئے ایک مستقل کتاب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہنگال کا تعلق غالب سے کیا رہا ہے؟ اس کی تفصیل ان کے مطالعے سے معلوم ہو سکے گی اور یہ انکشاف ہوگا کہ ہنگال میں غالب کے مخالفین ہی ’تھے‘ موافقین معتقدین اور تلامذہ بھی تھے۔

ہنگلادیش میں کتابت و طباعت کی جو دشواریاں ہیں، ان سے ہر منزل پر دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ آسانی صرف ڈھاکے میں محدود طور پر میسر ہے۔ راجشاہی یونیورسٹی میں درس و تدریس کے علاوہ جو وقت ملتا ہے وہ مطالعے اور اس کے بعد حاصل مطالعہ کی تحریر و تدوین میں گزرتا ہے۔ لیکن ہنگلادیش کے قیام کے بعد ایسے احباب کی کمی شدید طور پر محسوس ہوتی ہے، جن سے ادبی و علمی مسائل پر گفتگو کی جاسکے۔

میں یونیورسٹی کے کام سے ڈھاکا آیا ہوا تھا، شام صاحب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے افسانوں کا پانچواں مجموعہ چھپوا رہے ہیں۔ ان کے اس اقدام سے مجھے بھی اپنی کتاب کی اشاعت کی تحریک ہوئی۔ سوئے کی تصحیح میں ہر امکان کو ششش کی گئی ہے۔ لیکن انسانی لغزش سے دامن بچانا ممکن نہیں۔ توقع ہے کہ غالب سے ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب دلچسپی کا باعث ہوگی۔

راجشاہی یونیورسٹی — راجشاہی

بنگال میں غالب شناسی

مرزا غالب کی شخصیت جس طرح جاذب توجہ ہے اسی طرح ان کی شاعری قابل مطالعہ ہے۔ اگرچہ غالب کی وفات پر ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزرا لیکن اب تک جتنا کچھ ان پر لکھا گیا ہے وہ علامہ اقبال کے علاوہ کسی اور پر نہیں لکھا گیا۔ ہندوستان، پاکستان کے علاوہ روس میں بھی غالب پر جو کام ہوا ہے اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل غالب کی شخصیت کی رنگارنگی، فکر و فن کی توانائی، تخیل کی بلندی، طبیعت کی ندرت اور مزاج کی انانیت میں کچھ ایسی کشش اور جاذبیت ہے جس نے ہر مکتب فکر کے اصحاب علم و فن کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

غالب کی شخصیت و شہرت اور شاعری و فن کاری نے بنگال کو بھی متاثر کیا۔ جہاں چوبیسویں صدی عیسوی میں خواجہ حیدر جان شائق جہانگیر لکھی اور خواجہ عبدالغفار اختر جہانگیر لکھی غالب کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ شائق کے نام تو غالب کے فارسی خط سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے، جسے قاضی عبدالودود صاحب مرحوم نے آثار غالب کے عنوان کے تحت شائع کر دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں تذکرہ نسخہ دل کش، سراپا سخن،

سہ علمی گزشتہ، میگزین (غالب نمبر) ۱۹۴۵ء، غالب کے فارسی خط کی نقل کے لئے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا شکر گزار ہوں۔

نگارستان سخن اور سخن شعرا کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے صرف سنا دینے سنی شعراء میں شائق کو غالب کا شاگرد بتایا ہے اور یہ بھی کہ ان کا مختصر سادیوان نساخ کی نظر سے گزرا ہے معلوم نہیں یہ دیوان مطبوعہ تھا یا قلمی، بہر صورت اب ناپید ہے۔ غالب نے اس خط میں شائق کے حسب ذیل تین فارسی شعر پر جزوی اصلاح دی ہے اور معنی خیز توجیہ بیان کی ہے۔

(۱) مسح زمانست و جان منست این : ہمانان کہ روح دروان منست این

(۲) ہمیں خون بہا بس بود بعد قسلم : جو گوئی کہ از کشتگان منست این

(۳) نہ پیر سید گلے ز حال درونم : وفای بت بدگمان منست این

پہلے شعر میں غالب نے زمان کو جہان سے بدل دیا اور توجیہ یہ بتائی کہ جہان زیادہ لطیف ہے۔ دوسرے شعر میں جو گوئی کی جگہ بفرما کی ترمیم کر دی اور وجہ یہ بیان کی کہ جو گوئی سماعت پر گراں گزرتا ہے اور شعر کا مفہوم براہ راست سمجھ میں نہیں آتا، تیسرے شعر میں وفای کی جگہ ادائی تجویز کی ہے اور سبب یہ بتایا کہ یہ تسلیم شدہ ہے کہ محبوب بے وفا ہے اس لئے کبھی میرا حال دریافت نہیں کرتا، ایسی صورت میں بت کی صفت بدگمان خوش قیاس ہے۔ دوا کے ساتھ اس کا استعمال درست نہیں۔ اس طرح غالب نے شعر میں نازک خیالی پیدا کر دی۔

خواجہ عبدالغفار اختر کا یہ مقطع تو زبان زد خاص و عام ہے :

داد غالب بھی تجھے دیں گے زباں دانی کی

لے کے اختر جو یہ دلی میں غزل جائے گا

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہنگال میں غالب شناسی کی بنیاد غالب کے

عہد سے ہی پڑ چکی تھی اور غالب سے ہنگال کے شعراء کی جان پہچان کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اسے غالب کے فکر و فن کی عظمت سے تعبیر کیجئے یا ہنگال کے شاعروں کی خوش نصیبی سمجھئے جس کی بنا پر شاعری کی دنیا میں ہنگال کا رابطہ دلی سے باضابطہ قائم ہو گیا۔

اس کتاب میں خواجہ عبدالغفار اختر پر ایک الگ تفصیلی مقالہ پر قلم کیا گیا ہے جس سے میرے بیان کی تصدیق اور اختر کی شاعری کا اندازہ ہو سکے گا۔

انیسویں صدی میں بنگالہ نے ایک اور شخصیت پیدا کی جسے آقا احمد علی اصفہانی کہتے ہیں پینتیس سال کی عمر ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ورنہ ان کے ہاتھوں بلاشبہ کچھ اور قابل قدر علمی و تحقیقی کارنامے انجام پاتے۔ عین جوانی کے عالم میں ”قاطع برہان“ کے سلسلے میں غالب سے انکا ادبی معرکہ آرائی ہوئی جس کے ثبوت میں ”مؤید برہان“ اور ”شمیر تیز تر“ سے احمد علی کے وسعت مطالعہ کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ اسی کتاب میں اس موضوع پر غالب کے ایک حریف کے عنوان سے ایک مقالہ شریک اشاعت ہے اس لئے تفصیل کی بہار ضرورت نہیں غالب کے قول کے مطابق ایک دست کی اطلاع پر کہ مؤید برہان کے نام سے ایک صاحب نے ”قاطع برہان“ کا جواب لکھا ہے۔ غالب نے کتاب دیکھے بغیر احمد علی اصفہانی کے خلاف ایک قطعہ لکھ کر اپنی اخلاقی کمزوری کا ثبوت دیا۔ احمد علی کی کتاب کا لب و لہجہ عالمانہ اور محققانہ تھا۔ اور غالب کے قطعے کا انداز بیان ہجو یہ اور طنزیہ تھا۔ مزید یہ کہ اس ادبی نزاع میں احمد علی اصفہانی نے غالب اور ان کے طرف داروں کی فحش نگاری کے باوجود اپنی کتاب ”ہفت آسمان“ میں غالب اور ان کی مثنوی پر سنجیدہ اور عالمانہ انداز میں بحث کی۔ اسی ادبی معرکہ میں فدا سلہٹی کی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ فدا سلہٹی مولوی احمد علی کے شاگرد تھے اور انہیں نے غالب کے قطعے کا منظوم قطعے کی صورت میں جواب لکھا تھا۔ فدا کے بارے میں تذکروں میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ وہ اسی قطعے کی بدولت غالب کے مخالفین کی صف میں شریک نظر آتے ہیں۔ ان کا نام عبدالصمد تھا۔

غالب کے ساتھ بنگال کے تعلقات میں مزید استواری عبدالغفور خاں صاحب مؤلف

سخت شعراء کے ذریعہ پیدا ہوئی جنہوں نے اپنا پہلا دیوان ”دفتر بے مثال“ غالب کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجا اور غالب نے اس کے جواب میں یہ خط لکھا کہ

”جناب مولوی صاحب قبلہ! یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم بہ اسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے۔ افزائش غایت کا طالب ہے ”دفتر بے مثال“ کو عطیہ کبریٰ اور مہبت عظمیٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان مانا۔ میں دودش گو نہیں، خوشامد میری خونہیں دیوان فیض عنوان اسم با مستحق ہے۔ ”دفتر بے مثال“ اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند، شیخ امام بخش طرز جدید کے مؤجد اور پرانی نامور روشوں کے ناسخ تھے۔ آپ ان سے بڑھ کر بھید، مبالغہ، بے مبالغہ نساخ ہیں نظم و نثر فارسی کا عاشق اور مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔“

سرزمین بنگال سے ایک مدت تک مولانا ابوالکلام کی وابستگی رہی ہے، ان کی ذہانت، مطالعے کی وسعت اور حافظے کی قوت قابل رشک تھی۔ مولانا غلام رسول جبر کے نام ان کی جو تحریریں ”نقش آزاد“ کے حصہ دوم میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی نظر سے غالب کی تین تصویریں گزری ہیں۔ حالی کی یادگار غالب میں جو تصویر چھپی ہے اس کی حقیقت نشی رحمت اللہ رحمت نے مجھ سے بیان کی کہ

لے خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور) ۱۹۶۲ء، ۵۹۰ صفحہ ۵۹۱
۷ اشارہ ہے آقا احمد علی اصفہانی کی طرف، جنہوں نے قاطع برہان کے سلسلے میں غالب کی معرکہ آرائی
ہوئی تھی۔ سہ نقش آزاد، غلام رسول مہر (کتاب منزل لاہور) ۱۹۵۹ء، ۲۵۹ صفحہ ۳۲۷

انہوں نے تینوں کو پیش نظر رکھ کر ایک چوتھی تصویر اپنے تخیل کے مطابق تیار کی۔ اس سے غالب کی اصل صورت کا اندازہ ہمیں رکایا جاسکتا مولانا نے برسیل تذکرہ غالب کے استاد ملا عبدالصمد پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ فارسی زبان کے سبب و قواعد اور سنسکرت اور قدیم فارسی کا باہمی رشتے کا راز بھی اس پر کھل چکا تھا مگر یہ خیال میں محققین میں اب بھی یہ اختلاف ہے کہ واقعی ملا عبدالصمد کسی فرضی شخصیت کا نام تھا۔ مرزا غالب نے اپنی علمی استعداد کی تصدیق کے لئے اسے انسانی وجود بخشا تھا۔ مولانا آزاد پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ بتایا تھا کہ دساتیر کی حقیقت عبدالصمد پر بھی نہیں کھنی تھی۔ حال آنکہ یہ سرتا سر جعل و اختراع ہے اور قطعاً ظہور اسلام کے بہت بعد لکھی گئی ہے۔ اس کا محض بناؤنی اسلوب ہے جس میں پرانے الفاظ جمع کر دیئے گئے ہیں۔

”نسخ اور مرزا غالب“ کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ بقول نسخہ..... کلکتہ میں مرزا غالب کا ملنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے رہا اور انہوں نے پوشش و لباس میں بھی ایرانی وضع اختیار کر لی۔..... نسخہ کے کلام کے متعلق لکھتے ہیں، شیخ امام بخش طرز قدیم کے نسخہ تھے آپ بلا مبالغہ بصیرت و مبالغہ نسخہ ہیں۔ حالانکہ ان کا پورا کلیات تمام تر مخرافات سے لبریز ہے ایک مصرع بھی ایسا نہیں مل سکتا جس پر غالب کی یہ بے معنی مداحی صادق آسکے۔ مولانا شبلی کا خیال تھا کہ غالب نے یہ رقعہ لکھ کر انہیں بتایا تھا لیکن یہ باور نہیں کیا جاسکتا نسخہ ڈپٹی کلکٹر تھے ان کی سفارش سے ممکن ہے مقصد حاصل ہو سکے۔ مولانا نے کلکتہ میں غالب کی قیام گاہ کی نشاندہی محلہ شملہ بازار میں کی ہے۔ یہ چیت پور روڈ کے اس حصے میں تھی۔ جو بہہ کو گینڈا والا باب کے نام سے مشہور ہوئی۔

کلکتہ میں غالب کے خلاف جو ادبی ہنگامہ ہوا اس میں مولانا آزاد نے تین نام بتائے ہیں، پرنس غلام محمد (میسور) کے میر منشی احمد علی، دوسرے مدر علیہ

کے مدرس احمد علی (اصفہانی) تیسرے گورنر جنرل کے دفتر انشا کے ملازم مولوی وجاہت علی مکھنوی شاگرد قلیل۔ آقا احمد علی اس وقت پیدا نہ ہوئے تھے۔ مولانا کو مصدقہ اطلاع نہ دی گئی۔

نواب کلب علی خاں جب والی رام پور ہوئے تو یہ مشہور ہوا کہ سخت سستی ہیں اگرچہ غالب کا وظیفہ جاری تھا لیکن انہوں نے اس فحش کو دور کرنے کے لئے یہ قطعہ کہا تھا۔

ہند میں اہل تسنن کی ہیں دو سلطنتیں : حیدر آباد دکن رشک گلستانِ ارم
رام پور اہل نظر کہ ہے نظر میں وہ شہر : کہ جاں بہشت بہشت آگے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے اور ملک کر لوگ : اس طرف کو نہیں جلتے ہیں جو جلتے ہیں تو
غدر کے ایام میں شعرا کو حکم ہے کہ عید کے موقع پر تہنیت کے قصائد پیش کریں غالب
نے ایسا کیا ہو گا۔ البتہ دو قصیدہ اور ایک اردو قطعہ انہوں نے ضائع کر دیا۔ غالب کی مصلحت
پسند یہ کہنے یا سرکار پرستی کہ غدر کے بعد جب دربار ہوا تو بیر کے باوجود دو آدمیوں کے ہمارے
انہوں نے لفٹیننٹ گورنر کو زرافشاں کا غلہ پرایا کہ تہنیتی رباعی پیش کی تھی۔ مولانا نے حافظے
پر اعتماد کرتے تھے اس لئے انہیں مغالطہ ہوا۔ یعنی صفر بلگرامی آروی کی دلی میں غالب سے ملاقات
ہو، انہوں نے غلام حسین قدر بلگرامی سے منسوب کر دیا ہے۔ مولانا کا یہ خیال بھی نظر ثانی کا محتاج
ہے کہ صفر کا "جلوہ خضر" محض بے معنی ہے۔ اردو ادب میں تاریخی اور لسانی حثیت سے
اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے ذوق سے فرمائش کی کہ اردو کا سب سے بہتر
شعر سنناؤ، کچھ ناممل کے بعد ذوق نے غالب کا یہ شعر پڑھا۔

دریائے معاصی تک آبی سے ہوا خشک : میرا سردامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
مولانا آزاد نے غالب کے آخری دور کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی کا تذکرہ
بھی کیا ہے شوخی رام پور کے باشندہ تھے۔ کلکتہ کی مشہور طوائف گوہر جان سے نواب میر حسن خاں
کا تعلق تھا۔ انہیں نے رقیبوں سے پاسبانی کے لئے شوخی کو کلکتہ میں متعین کر رکھا تھا۔ ان کے

اس شعر کا حوالہ دیا ہے۔

ہوئی شوخی جو حجت وصل میں اس ماہ پیکر سے
گو اہی ہم نے دلوا دی، شکن آلودہ بستر سے

بیسویں صدی کے آغاز میں خان بہادر رضا علی وحشت لکھنؤی جیسا پرستار غالب ہنگال میں وارد شعر و سخن دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ وحشت کا پہلا دیوان مطبوعہ ۱۹۱۰ء کا مطالعہ کیجئے تو اوّل سے آخر تک وحشت کے کلام میں غالب کی زمین، غالب کی ترکیب اور غالب کے مضنون و موضوع کی شمولیت سے حیرت ہوگی کہ یہ شاعر کس قدر غالب کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جس کی داد مولانا حالی اور حسرت موہانی بھی دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ وحشت نے نظم کی صورت میں غالب کے فکر و فن کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس نظم کے دو ابتدائی بند پیش ہیں۔

نیم صبح گاہی ہے، کلام جانفزا تیرا دلوں کو جوش میں لاتا ہے، رنگ آشنا تیرا
بہارستانِ مضمون ہے، خیالِ نکتہ زاتیرا فروغِ طبع کی معراج ہے، فکرِ رسا تیرا
ترا دیوان غالب، دفترِ نازک خیالی ہے
ترا پایہ سخن دانانِ ہندوستان میں عالی ہے

ظہوری ہو کہ طائب تیرے دل کا راز کیا سمجھے ادا دانی کو تیرے عرفی شیراز کیا سمجھے
حزین یہ شیوہ فکرِ چین پر داز کیا سمجھے تیری ترکیب کیا جانے ترا انداز کیا سمجھے
ہوا ہے رنگِ افزلے عجم ہندوستان تجھ سے لے
بنی یہ سرزمینِ رقی کی گویا اصفہان تجھ سے

ڈاکٹر عبدالرشید انصاری مرحوم صدر شعبہ اردو فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کا مقالہ مرزا غالب اور دوسرے غالب، ایک نئے زاویہ نظر نگاہ پر محیط انداز سے سپرد قلم کیا گیا جس میں انہوں

نے غالبؔ تخلص کے دس شاعروں کا حال مختلف تذکرہ کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ان میں سے کچھ غالبؔ کے معاصر تھے اور کچھ غالبؔ کے عہد سے پہلے گزر چکے تھے چنانچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مرزا غالبؔ کو اس کا علم نہ ہو، اس سلسلے میں ڈاکٹر شادانی فرماتے ہیں:

”یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جو شخص ہر معاملے میں اپنی انفرادیت اور شان امتیاز کو باقی رکھنا چاہتا تھا، جس نے اپنے خیالات کی جدت و ندرت پر ہمیشہ ناز کیا۔ اس نے تخلص کے معاملے میں کسی جدت کا ثبوت نہیں دیا“

ڈاکٹر شادانی کے خیال میں مرزا غالبؔ کی اہمیت و مقبولیت کی بنا پر ان کا غیر مطبوعہ کلام تلاش و جستجو کے بعد آٹھ دن رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ جسے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو مرزا غالبؔ کا کلام نہیں مگر کسی اپنی معلومت کی بنا پر اسے غالبؔ کے نام سے منسوب کر دیا۔ دوسرے وہ جو مرزا غالبؔ کا کلام ہے اور تیسرے وہ جو کسی اور غالبؔ کا کلام ہے مگر مرزا غالبؔ کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ چونکہ لوگ عام طور پر کسی دوسرے غالبؔ سے واقف نہیں اس لئے جو غیر مطبوعہ کلام انہیں غالبؔ کے نام سے ملتا ہے اسے وہ مرزا غالبؔ کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۱۹۴۹ء) سے ایک غیر مطبوعہ غزل پیش کی ہے جو تذکرہ ”دیوانِ جہاں“ مصنفہ! یعنی تراش جہاں میں نیاز بیگ خاں کے بیٹے غالبؔ دہلوی سے منسوب ہے۔ اس لئے ہر غیر مطبوعہ کلام کو بعض ظن و قیاس کی بنا پر مرزا غالبؔ کا کلام سمجھ لینا تحقیق کی روش کے منافی ہے اور یہ غیر مطبوعہ کلام مرزا غالبؔ سے منسوب کرنے سے قبل غالبؔ تخلص کرنے والے دوسرے شعراء کا طرف بھی توجہ دینی چاہیے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔

”مرزا غالبؔ پر عندلیب شادانی صاحب کا بے جا الزام کے عنوان سے ایک جوابی

مضمون ملتا ہے جس پر لکھنے والے کا نام مشیر درج ہے۔ دراصل ڈاکٹر خلدانی نے ایران کی امر دہیستی کا اثر اردو شاعری پر لکھا تھا اور اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اردو شاعری سے صرف غالب کے اشعار پیش کئے تھے مقالے کا انداز ہلکا پھلکا یا استہزائی تھا اس لئے ان کے قلم کا نشاندہ اتفاق سے مرزا غالب بن گئے۔ مضمون نگار کو یہ شکایت ہے کہ شعر کو صحیح طور پر سمجھنے کے بجائے شادانی صاحب نے اس کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے جس سے غالب کی شخصیت مجروح ہوئی ہے۔ بقول ڈاکٹر شادانی:

”مرزا نے اس آبرو باخۂ معشوق کے ہاتھوں اپنے قتل کا واقعہ بہت تفصیل سے لکھا ہے:“ ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں: جب تو ہی خیر آزمائے ہوا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ: ہائے اس زوریشیاں کا پیشاں ہونا
ڈاکٹر اختر نام مشرقی زبانوں کے علاوہ مغربی زبانوں کے بھی فاضل ہیں پہلے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ عربیہ سے وابستہ تھے۔ پھر سری لنکا میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔
اب درس و تدریس سے سبکدوش ہو کر وہیں سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا خیال انگیز علمی اور ادبی مقالہ کلکتہ کے دوران ملازمت میں ”غالب کا زکراخانہ“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ انہوں نے یورپ کے تصویر خانوں میں ادبی مصوری کا مطالعہ کیا ہے اور رنگارنگ تصویریں پر فنی نقطہ نظر سے غور بھی کیا۔ لیکن ہندوستان واپس آکر غالب کے نگار خانہ سخن میں ایسی دلکش تصویریں ملیں جن سے ان کے ذہن میں جلا پیدا ہو گئی۔ مثلاً مرزا کا یہ مطلع پیش کرتے ہیں:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے: جو شش قدم سے بزم چراغاں کئے ہوئے
پہلے مصرع میں محبوب کو مدعو کرنے کی لطیف تمنا پوشیدہ ہے مگر دوسرے

میں جو بزم آرائیوں کے لئے اہتمام کیا جا رہا ہے اس کا جواب اردو تو اردو فارسی اور تمام آریائی زبانوں میں مشکل سے مل سکے، کم از کم المانوی، فرانسیسی اور انگریزی ادب میں تو اس نوع کا کوئی تصور پیش نہیں کیا جاسکا۔ سرخ انگوری شراب جو "یار" کی طرف بڑھائی جائے گی اس کے نور سے بزم اس طرح جگمگا اٹھے گی جیسے بیسوں چراغ قرینے سے جھلسلا رہے ہوں۔ پھر "جوش قدح" نے تصور کو جو پرواز بخشی ہے وہ توضیح سے بے نیاز ہے شراب کے رنگ رنگ جلوؤں کو غالب نے جس طرح دکھایا ہے ان سے بے پے ہم دماغی نشاط حاصل کرنے لگتے ہیں۔

موج گل سے چراغاں ہے گزرگاہ خیال : ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب
بہار کی شان میں دنیا کے تقریباً تمام شعرا نے رنگ برنگ کے گل کھلائے ہیں
اور جہان کم محاکات کا تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ فارسی میں حافظ اور نظری عربی
میں الصنوبری اور ابن زیدوں، انگریزی میں ورد سویتھ اور کیٹس، المانوی میں گوٹے
اور شلر اور سنسکرت میں کالی داس اور بھوقی نے جو بہار یہ مناظر دکھائے ہیں ان کا عطر
غالب کا ایک شعر قرار دیا جاسکتا ہے۔

ہے جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف : اڑتے ہوئے الجھتے ہیں، مرغ چین کے پاؤں
بہار کی محو رنضا میں مرغ چین جو اڑنا چاہتا ہے تو زنگار رنگ پھولوں اور شاخ، رشاخ
سیلوں میں الجھ جاتا ہے۔ غالب کہتے ہیں "فرش سے تاعش واں طوفاں تھا موج رنگ کا"
علامہ ابن رشیق نے "قراضۃ الذہب" اور "العقدہ" میں متحرک تشبیہوں کو صنف شاعری
میں ایک خاص اہمیت دیکھی ہے۔ چنانچہ موج رنگ کے تصور نے غالب کے شعر کو جو اہمیت
بخشی ہے اس نے انہیں دنیا کے بڑے شعرا کی صف میں ایک ممتاز جگہ دیکھی ہے۔

"غالب اور امیر کے عنوان سے جناب قربان علی عطری کا ایک مضمون کلکتہ میں شائع

ہوا تھا۔ اس میں غالب اور امیر مینائی کے ہم معنی اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لفظی و معنوی موثر کافی سے کام لیا گیا ہے۔ دونوں شعربیش ہیں :

کوئی میرے دل سے پوچھے تب تیرے نیم کش کو
یرغلتش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا (غالب)

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چسپائی

وہی تیر کیوں نہ سارا جو جگر کے پار ہوتا (امیر مینائی)

عصری صاحب کے خیال میں غالب کا پہلا مصرع صرف مکمل ہی نہیں مؤثر بھی ہے۔ اس کے مقابل امیر کا پہلا مصرع مکمل تو ہے لیکن اس میں کرخگی ہے (توجہ سمجھ میں نہ آئی) غالب نے مصرع ثانی میں پہلا مصرع کے مفہوم کو وسعت دیتے ہوئے مزید اثر کا اضافہ کیا ہے۔ امیر پہلے مصرع کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تیر کے متمنی ہیں جو جگر کے پار ہوتا۔ اس مصرع میں وہ نزاکت نہیں ہے جو غالب کے شعر کے ہر لفظ میں ہے۔

عصری صاحب کا دوسرا مضمون اسی رسالے میں "غالب" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوا ہے اس میں انہوں نے غالب کا یہ شعر سر عنوان قرار دیا ہے :
پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن : دست مہزون خار خار رہن غنا نہ تھا
دیوان غالب کے کسی شارح نے اس شعر کے مفہوم میں عصری صاحب نے اختلاف کیا ہے اور اپنے مطلب کی تصدیق کے لئے غالب کے دو شعروں سے مدد لی ہے لیکن ان کا بیانیہ اتنا کجنگ ہو گیا ہے کہ اصل مفہوم واضح نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر حنیف فوق جو ڈھاکہ کابوئرسٹی کے ایک روشن خیال استاد اور اپنے تنقیدی زاویہ نظر اور فکر انگیز مضامین کی وجہ سے موجودہ نقادوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے

دیکھے جاتے ہیں۔ غالب کی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ انہوں نے اپنے منہوں پر عنوان غالب میں غالب کے کلام کا تجزیہ بڑے حسن و خوبی سے کیا ہے۔ ان کے خیال میں غالب اردو کے عظیم ترین شاعر ہیں ان کے سبب ان کی توانائی اور فکر کی گہرائی ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے کلام میں آفاقیت پائی جاتی ہے اور اس سے غالب کے نئے ذہنی افق کا پتا چلتا ہے۔ ان کی شاعری میں ماضی کے تہذیبی ورثے کی گونج، حال کے تاریخی شعور کی جھلک اور مستقبل کے امکانات کے نقوش ملتے ہیں ان کے یہاں تخیل کی بوقلمونی اور بالغ نظری، شاعرانہ تندر و قیمت کا تعین کرتی ہے ان کی شاعری میں کلاسیکی اقدار کا حسن سمٹ آیا ہے۔ لیکن وہ نئے دور کے پیش رو بھی ہیں۔ ان کے کلام کی شائستگی اور نفاست مغلیہ تہذیب کا ایک پر تو ہے۔ غالب نے بیک وقت اسلام کی تہذیبی روایات اور ایرانی تمدن و ثقافت سے اکتساب و استفادہ کیا ہے۔ وہ اپنے عہد کے ایک اہم فارسی ہی دتھے بلکہ فارسی شاعری پر گہری نظر بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے شکسپیر کی طرح زندگی کے تضادات کو پیش کیا ہے، ان کے یہاں حقائق کا منہات بادہ و ساغر کی اصطلاحوں میں بیان ہوئے ہیں۔ غالب نے موت و حیات، وحدت و کثرت، حسن و عشق، خیر و شر، حقیقت و مجاز اور انسان و ماحول کے تضاد و کشمکش سے شاعرانہ صداقتوں کا خمیر اٹھایا ہے ڈاکٹر جاوید نہال (سابق صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد کالج، کلکتہ) نے غالب کا کلکتہ سے رشتے کے عنوان سے ایک دلچسپ مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس مقالے میں بیشتر وہی باتیں بیان کی گئی ہیں جو غالب کے سفر کلکتہ سے متعلق ہیں۔

غالب نے اپنے احباب کو خط لکھتے وقت بھی کلکتہ کی مدح سرائی کی ہے۔ لیکن مدر مرہ عالیہ کے شاعر میں غالب پر جو اعتراضات کئے گئے تھے ان سے ان کے دل پر جو کچھ

۱۔ ڈاکٹر حنیف فوق کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے حال ہی میں سبکدوش ہوئے ہیں۔

مثبت قدریں (دبستان مشرق ڈھاکا) ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۷ء

۲۔ تحقیق و تنقید (اریب بلیکسٹرن، کلکتہ) ۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۰ء

گئے وہ ناقابل برداشت تھے۔ کلکتہ میں ادبی تناسل کی وجہ سے غالب کے مخالفین کی اچھی خاصی تعداد پیدا ہو گئی تھی کیونکہ شعراء ادب کی دنیا میں وہ قلیل کے معقد تھے اور غالب قلیل کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ لیکن یہیں مولوی سراج الدین جیسا خاص دوست بھی غالب کو مل گیا جس نے ان کی مدافعت اور دلجوئی کی۔ غالب اپنی نفاست پسند طبیعت اور مزاج کی انانیت کے باعث کلکتہ میں قیام کرنے کے باوجود صرف شعراء اور خواص کے طبقے سے ملتے تھے۔ انہوں نے کبھی عوامی تقریب میں شرکت نہ کی، فاضل مقالہ نگار کے خیال میں غالب نے نسخ کے دیوانی ”دفتر بے مثال“ کی رسید کے طور پر جو خط لکھا اور اس میں نسخ کی شاعری اور فن کی جو مدح سرائی کی وہ ان کے کردار کا ایک کمزور پہلو ہے جو ان کی فطرت اور مزاج کے منافی ہے۔ ڈاکٹر عابدی دہرہال نے اس مقالے میں کچھ ایسی باتیں بھی کہی ہیں جو نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ اور بعض کی بنیاد تو صرف مفروضے پر ہے مثلاً:

(۱) انہوں نے لکھا ہے کہ کلکتہ کے معترضین کے خلاف اپنے دل کی بھر اس نکلنے کو غالب نے ”بادی الخاف“ جیسی مثنوی لکھی۔ یہ درست نہیں۔ دراصل یہ مثنوی غالب نے فخلص احباب کے مشورے پر اپنی صفائی بیان کرنے کے لئے لکھی تھی۔ اس کا مقصد مخالفین و معترضین کے ہنگامے کو روکنا تھا۔

(۲) غالب کلکتہ کا دوسرا سفر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن عسرت دامگیر ہوئی۔ فاضل مقالہ نگار کی اس تحریر کی کسی اور ذریعے سے تائید نہیں ہوتی (ص ۱۲۶-۱۲۸) یہ خیال بھی صحیح نہیں۔

(۳) ”قاطع برہان“ کلکتہ کے ادبی معرکے کے جواب میں لکھی گئی۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں۔
 دراصل کلکتہ کا ادبی معرکہ ۱۸۴۸ء میں ہوا اور ”قاطع برہان“ کی اشاعت ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔
 (۴) غالب ۱۹ نومبر ۱۸۴۸ء میں کلکتہ آئے اور ۱۴ اگست ۱۸۴۹ء تک یہاں رہے۔ اس طرح غالب کے قیام کلکتہ کی مدت تقریباً نو مہینے دو دن ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب

نے تین جگہ یہ نکتہ ہے کہ غالب کلمتے میں ڈیڑھ سال رہے (۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱) یہ بیان بھی نظر ثانی کا محتاج ہے۔

(۵) فاضل مقالہ نگار کے بقول غالب کی آمد اور ادبی نزاع سے کلمتے کا ادبی ماحول نکھر گیا اور معیاری ادب کی تخلیق ہونے لگی۔ اس طرح کلمتے کو اردو ادب میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی گویا غالب کے ورود کلمتے سے پہلے یہاں غیر معیاری ادب کی تخلیق ہوتی تھی اور غالب کلمتے نہ آتے تو اسے اردو ادب میں بین الاقوامی شہرت حاصل نہ ہوتی۔ غالب کے دور میں اردو ادب میں الاقوامی ادب ہی کب تھا جو کلمتے کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوتی (۱۲۵)

(۶) غالب (شہر نگاراں کی رنگینیوں اور نازنین بتان خود آرا کے جلوؤں، دہنوار اشاروں اور ریشمی مسکراہٹوں میں پنشن کا غم، اعتراض کی تلخیاں اور مخفی فتن کی تلخ کلامیاں سب کچھ بھول گئے تھے (۱۲۱) اگر ایسا ہوتا تو خود ہی بقول فاضل مقالہ نگار غالب "باد مخالف" اور قاطع ہر ہاں "کیوں نکلتے۔

(۷) الف) کلمتے میں غالب سے نسخ کا غائبانہ تعارف مولوی سراج الدین کی ملاحظت سے ہوا تھا۔ (ب) جس وقت غالب کلمتے میں سکونت پذیر تھے، نسخ بھاگل پور میں تھے (۱۲۷) دونوں باتیں بے بنیاد ہیں اس لئے کہ نسخ کی پیدائش ہی اس وقت نہ ہوئی تھی وضاحت کے لئے یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ نسخ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے اور غالب کلمتے ۱۸۲۸ء میں آئے تھے۔

(۸) غالب کلمتے میں محبوب جفا پیشہ کا دل ڈھونڈتے رہے، مگر دل نہیں ملا کیونکہ یہ فولادی دل تھا کسی بات سے نہیں پسیتا تھا اور دلی میں وہ اس کی یاد میں اپنے سر پر ہتھ مار تے تھے۔ (۱۲۷) موصوف نے غالب کے ان اشعار کا ترجمہ کر دیا ہے۔
گفتم ایوان جگر ولی دارند گفت دارند لیک از آہن

گفت از بہر داد آمدہ ام .. گفت بگریز و سر بہ سنگ بزن

غالب نے جو بات شاعرانہ انداز میں کہی تھی، فاضل مقالہ نگار نے نثر میں اس کے حسن کو غارت کر دیا۔ غالب کے محبوب نے سر کو پتھر پر پٹکنے کا مشورہ دیا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے یہ لکھ دیا کہ غالب سر پر پتھر مارتے تھے۔ جیسے شاعری کے علاوہ ان کا بس یہی شغل تھا۔

ڈاکٹر جاوید نہال کا ایک اور مختصر مقالہ ”غالب کا ایک شعر“ کے عنوان سے مجلہ ”دستاویز کلکتہ“ میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کے خیال میں غالب ایک عہد آفریں شاعر ہے جس کی آنکھوں نے انقلابات زمانہ دیکھے۔ اور جس نے مشرق اور مغرب کی قدروں کے امتزاج سے اپنی شاعری کو پروان چڑھایا۔ غالب کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے دور کی شاعری ظہوری اور بیدل کے زیر اثر پیچیدہ اور ناقابل فہم ہے دوسرے اور تیسرے دور کی شاعری میں غالب کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ زیر بحث شعر اسی دور سے متعلق ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کے بنیادی ادبی رویے میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ جس کی وجہ سے بعض مادہ اشعار کے مفہوم تک ذہن کی رسائی بہ آسانی نہیں ہوتی ہے۔ جیسے

وہ اور آرائش خم کا کل : میں اور اندیشہ ہلے دور دراز

اس شعر میں غالب کی ندرت ادلے اسی جمالیاتی حسیات اور کیفیت پیدا کر دی ہے جو صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔ محبوب آئینے کے سامنے کھڑا ہوا جسے سنور نے میں کچھ اس طرح محو ہے جس سے شاعر کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ اگر اس بے وفائی کی تو رقیب کی قیمت جاگ اٹھے گی۔ یہ شعر صرف سہل مستع کی ایک اچھی مثال ہی نہیں بلکہ غالب کی معنی آفرینی کا ایک نمایاں ثبوت بھی ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر صاحب کے واضح ذہن اور شگفتہ اسلوب تحریر کا نمونہ ہے۔

پروفیسر شاہ مقبول احمد (سابق صدر شعبہ اردو مولانا آزاد کالج، کلکتہ) ان بزرگوں میں ہیں جو بڑی خاموشی سے ادب کا مطالعہ فرماتے ہیں اور موقع موقع سے اپنے خیالات کو مضمون کی شکل دیتے ہیں۔ قدیم ادب کے دلدادہ کم سخن اور گوشہ نشین ہیں لیکن مغربی بنگال میں ان کے شاگردوں کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی جو توسیع و اشاعت ہو رہی ہے اس کے لئے ان کی شخصیت قابل احترام ہے۔ موصوف کی تحریروں کا مجموعہ ”تمہیات اشارات“ کے نام سے ۱۹۵۷ء میں کلکتہ ہی سے شائع ہوا۔ اس میں غالب کے ”دو شعر“ کے عنوان سے ان کا ایک مختصر سا مضمون شامل ہے انہوں نے غالب کے ان دو شعروں کی ادبی اور فنی نقطہ نظر سے وضاحت کی ہے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی اجازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا
دہر مرنا تو جینے کا مزہ کیا

مضمون کے آغاز میں فرماتے ہیں کہ ”اہل نقد کے نزدیک یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ غالب کسی مربوط و مسلسل نظام فکر کے خالق نہ تھے جو ان کی دنیا کے افکار کو بر تمام و کمال اپنے احاطہ و تحیل میں لئے ہوئے ہوا اور اس کی مراحت و وضاحت کا ترجمان ان کا سرمایہ سخن ہو۔“ مختلف موضوعات جو اردو شاعری کے علامہ اور دو عنوانات ہیں غالب کی شاہراہ شاعری کے نشانات منزل معلوم ہوتے ہیں۔ انفرادیت بھی ایسی خصوصیت نہیں جس کو صرف غالب کے فن کے ساتھ بطور خاص مخصوص کیا جاسکتا ہو۔“ پروفیسر صاحب کی اس تحریر سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالب کی عظمت و انفرادیت کے قائل نہیں اگرچہ یہ درست ہے کہ غالب کے یہاں کوئی مربوط و مسلسل نظام فکر نہیں یہ تہیدی

سطح پر تھیں۔ موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ”غالب اگر روایت پرست نہیں تو آسادہ بغاوت قسم کے روایت شکن بھی نہ تھے۔۔۔۔۔ اپنے عہد کے معاشرے میں جاری و ساری عقائد و افکار اور میزان و اقدار ہی غالب کے قصہ تخیل کی اساسات و کائنات معلوم ہوتی ہے۔“

بائیں ہمہ یہ امر غور طلب ہے کہ غالب کے فکر و فن کے کون سے خدوخال ہیں جو جملہ شعرا اردو میں ان کو نشانات و امتیاز عطا کرتے ہیں اور ان کے زریعہ افکار اپنے آب و رنگ کے اعتبار سے ”در انجمن تنہا“ کی مثال معلوم ہوتے ہیں۔ اصل میں غالب کے افکار کے پس پردہ ایک ایسا بالغ شعور اور پختہ ذہن کا رفرمانظر آتا ہے جو دنیا کے ادب میں ان کی دیو قیامت کی باعث ہے۔ خیالات و افکار کچھ ایسے سانچوں میں ڈھل گئے ہیں اور مناسب و موزوں الفاظ میں ادا ہو گئے ہیں کہ زمان و مکان کی قیود سے آگے نکل کر ابدیت کے احاطہ گیر ہو گئے ہیں۔ غالب کے مذکورہ بالا اشعار کی تشریح و توضیح میں شاہ صاحب نے جو موثر شکافی اور نکتہ آفرینی فرمائی ہے، اہل نقد و نظر کے لئے اس میں مزید نکتہ سمجھی کی گنجائش ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ غالب کے عہد، معاشرے، فکر و فن اور ذہن و شعور کے متعلق مختصر مگر جامع طور پر جو اظہار خیال کیا ہے وہ قابل توجہ اور لائق اعتناء ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف کلکتہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے سابق ریڈر و خاموش طبع، منکر المزاج مگر اردو ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اپنے موضوع پر سنجیدگی سے غور و فکر کرتے ہیں اور زبان و بیان کی لطافت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ”تلاش معیار“ ۱۹۷۸ء میں مکتبہ رحیمی، کلکتہ سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں غالب سے متعلق دو صفحہ ہیں ”ایک غالب اور سر سید احمد خاں“ دوسرا ”بیان غالب کا ایک پہلو“۔

پہلے مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ غالب کی عمر اگرچہ سر سید سے بیس سال زیادہ

تھی۔ لیکن دونوں میں قدر مشترک بھی تھی یعنی مذہبی عقائد پر کڑی نکتہ چینی اور انقلاب
اصلاح معاشرہ کی طرف دونوں کا رویہ ایک ہی تھا۔ مستقبل کی دینیکے بارے میں دونوں
کا زاویہ نظر ایک تھا، البتہ سماجی زندگی بسر کرنے میں غالب اور سرسید کا طریق کار مختلف
تھا۔ سرسید نے آداب معاشرت اور رسم پرستی پر ضربیں لگائیں اور غالب غیر شعوری طور
پر اس تمدن سے جھٹے رہے جو اپنی آب و تاب کو کرب غروب ہونے والا تھا۔ غالب کا
سماج کے جس طبقے سے تعلق تھا وہ تادم آخر اس کے پابند رہے۔ لیکن شاعری کے باب میں
روایات کی تقلید کو ایک بے معنی سی چیز سمجھتے رہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ
میں ایک شاعر بھی ایسا نہیں ملے گا جس کا لب و لہجہ اور زبان و بیان غالب کا سا ہو۔
سرسید نے بڑی محنت و کاوش سے آئین اکبری کی تصحیح کی اور غالب کے پاس تقریظ
لکھنے کے لئے بھیج دی۔ غالب نے مثنوی کی صورت میں تقریظ لکھ دی۔ مثنوی کے خاتمے پر
سرسید کی ذات گرامی سے غالب نے اپنی نیازمندی کا یوں اظہار کیا ہے۔

درجہاں سید پرستی دین تست ۱۰۔ از ثنا بگزشتہ دعا آئین تست

اس کے باوجود جانے کیوں انہوں نے آئین اکبری میں اسے شامل نہیں کیا۔ اس لئے ایک دوسرے
کو بقول حالی حجاب دامن گیر ہو گیا تھا۔ غالب جب رام پور سے دہلی واپس جا رہے تھے۔
تو مراد آباد کی سرائے میں مقیم ہوئے۔ سرسید کو اطلاع ملی تو وہ انہیں اپنا مہمان بنا کر
لے گئے۔ اور غالب کی شراب کی بوتل ایک کوٹھڑی میں رکھوا دی۔ غالب کو جب بوتل کی تلاش
ہوئی تو سرسید نے کوٹھڑی میں لے جا کر دکھا دی۔ غالب نے اسے غور سے دیکھ کر کہا، ”بھئی اس
میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے؟“ سرسید ہنس کر چپ ہو گئے اور اس طرح دونوں کے درمیان تجر
خفیف سی شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی، ختم ہو گئی۔ گویا اس طرح دونوں کے تعلقات ہوار ہو گئے۔

دوسرا مضمون ”بیان غالب کا ایک پہلو“ غالب کے اسلوب شاعری اور مضمون

آخری کے متعلق ہے چنانچہ ڈاکٹر عبدالرؤف کے خیال میں غالب کی عظمت کا راز ان کے انداز بیان

میں مضرب ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں بخور بہت اچھے :- کہتے ہیں کہ غالب کہے اندازِ بیاں اور شعرا کو عام طور پر صرف مضامین کی تلاش ہوتی ہے لیکن غالب کو مضامین اور اندازِ بیاں دونوں کی تلاش تھی، غالب کی شاعری میں بڑی وسعت ہی نہیں بلکہ لفظوں کے ذریعہ پیکر تراشی اس کی خوبیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اس لئے غالب انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر ہے

آج مجھ سا نہیں زمانے میں : شاعرِ نغز گو و خوش گفتار

محض تعلیمی ہی نہیں، ایک تاریخی حقیقت ہے۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب موصوف کے خیال سے اتفاق کیا جاسکتا ہے لیکن ان کا یہ کہنا کہ غالب کے یہاں "لفظوں سے جو تصویریں اور پیکر بننے ہیں ان کی مثال انیسویں صدی کے عالمی ادب میں نہیں ملتی، بمباغذ آئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں غالب کے طرزِ بیاں کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں زندگی جانی والی چیزوں کے پیکر اس انداز سے ابھرتے ہیں کہ احساسات کی آنکھیں ان کا مشاہدہ کرنے کے بعد ان کی کم و بیش کیفیت کا اندازہ کر سکتی ہیں۔ "غم بستی" ایک مجرور اور "غیر مرئی" تھے۔ لیکن شاعر کے اعجازِ بیاں نے اسے ایک مادی شکل بخش دی۔ اور مرئی ہو گیا۔

- غم بستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج : شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر منے تک -
مختصر یہ کہ غالب کا یہ پہلو شعر و ادب کی دنیا میں ایک اعجاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا آغاز دارالافتاد نہایت سنجیدہ اور دلکش ہو رہا ہے۔ لیکن مضمون جب عروج پر پہنچتا ہے تو یک بیک ختم ہو جاتا ہے اور قاری کی یہ خواہش باقی رہتی ہے کہ "کچھ اور چاہیے وسعت ترے بیاں کے لئے"۔

ڈاکٹر ظفر اوکاوی (پروفیسر شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) نقاد بھی ہیں اور فنکار

بھی یہ ان کا مقالہ ”غالب کا شعور فن“ فلسفہ و نفسیات کی روشنی میں غالب کے فن میں ایک انفرادی شعور و عظمت کے امکانات کی تلاش ہے۔ ان کی عظمت کا سبب ان کا بیدار فنی شعور تھا جو ان کے تخلیقی عمل میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس میں جو عوامل ترکیبی زیادہ اہم ہیں، ان کا تعین یوں کیا جاسکتا ہے :-

(۱) غالب کا ماضی سے رشتہ — کلاسیکی ادب کا مطالعہ اور اس کے اثرات۔

(۲) غالب اور حال — ہم عصر سماجی اور ادبی حیثیت۔ اقتصادی حالات اور ان کا

شعور۔

(۳) مستقبل کے امکانات پر غالب کی نظر۔

غالب کا ماضی سے رشتہ بتاتے ہوئے پروفیسر صاحب نے لکھا ہے ”غالب و میر کی ذہنی مماثلتوں کے نقوش، دونوں کی نازک مزاجی اور احساس برتری کے علاوہ ان کے اپنے شعور فن کی روشنی میں بھی تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ میر کا یہی انداز غالب تک پہنچ کر روشنی خاص کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔۔۔ وجہ سے غالب تک فنی اقدار اور روایات کا اگر جائزہ لیا جائے تو بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان تینوں کے فنی رویے اور شعور میں کم و بیش اشتراک پایا جاتا ہے۔ غالب کئی روایتوں سے فیضیاب ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے کلاسیکی فارسی اور اردو شاعری دونوں کا وسعت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا تھا، البتہ انہوں نے ماضی کے شعری و ادبی ورثے سے جو کچھ اکتا ب کیا تھا اس کی پیروی نہ کی بلکہ ان کی انانیت نے انفرادیت کی شکل اختیار کر لی۔ جیسے شعور فن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ غالب نے اپنے گرد و پیش کے اثرات قبول کئے ہیں۔ جن کی مثال ان کے اشعار، خطوط اور شاگردوں کے کلام پر ان کی اصلاحوں کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ گویا غالب ہر لمحہ تغیر و تبدل سے ہم کنار تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شعور آشنا تھے۔ حال کے ساتھ ان کے تعلق کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ غالب اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی اثرات سے دامن نہ بچا سکے۔ اور غم ذات سے غم روزگار تک ان کا شعور ہی ان کی

رہنمائی کرتا رہا۔

پروفرسیر صاحب کے بقول غالب کے شعور فن کی وضاحتیں دیوان غالب میں دو طرح سے ہوئی ہیں۔ اول اشعار جن میں غالب نے اپنے شعور فن کے متعلق براہ راست اظہار خیال کیا ہے، دوم وہ اشعار جو معنوی اعتبار سے بظاہر کسی اور موضوع سے مربوط ہیں لیکن ان سے بھی غالب کے فنی عمل اور شعور فن کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس طرح غالب کے نظریہ فن اور فنی عمل میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ غالب کی عظمت کی نمایاں دلیل ہے۔

مستقبل کے امکانات پر غالب کی وسعت نظر کی تفصیل کے سلسلے میں فاضل مقالہ نگار نے صرف یہ بتایا ہے کہ غالب کا شعور فن اپنے محاسبے میں سارے اس اس مقولے پر پورا اترتا ہے۔

”شعور اپنے امکانات میں مستقبل ہے نہ کہ حال اور ماضی“ چنانچہ غالب خود بھی اس سے آگاہ تھے۔ در زیرِ نہ کہتے۔ ”شہرِ شمعِ رنگینی بعد میں خواہد شدن“ ڈاکٹر عبد المنان، کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر ہیں مطالعے کے ساتھ ساتھ ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ ان کے دو مضامین ”میر اور غالب“ اور ”غالب کی عظمت“ قابلِ توجہ ہیں۔ ”میر اور غالب کے متعلق کہتے ہیں کہ اردو شاعری میں میر اور غالب دو ممتاز نام ہیں جن کی امتیازی صفت یہ ہے کہ دونوں شعرا نے اپنے عہد میں انفرادیت کا نقش چھوڑا، اردو شاعری کو نئی ڈگر پر لا کھڑا کیا۔ نئی سمت و جہد (جہت ۶) عطا کی۔ غالب اور میر کی ذہنی ساخت ایک جیسی تھی۔ مردِ فکر کا انداز ایک جیسا تھا لیکن اظہار کی نوعیت جدا تھی۔ غالب کو زندگی کے جو عمیق اور بلند (وسیع) تجربے حاصل ہوئے تھے ان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے افکار کی دنیا وسیع بھی ہو اور بلند

۱۔ نقد و نگاہ۔ ڈاکٹر عبد المنان (نشاط بک ڈپو پریس فیروز پور، کلکتہ ۱۳۷۱ء)

بھی۔ انہوں نے مشاہدے کو جو حسن عطا کیا وہ ان کی فنکاری کی بہترین مثال ہے۔ غالب کے یہاں زندگی سے بے حد محبت کا جذبہ ہے، ان کا اچھوتا اسلوب فکر کی خرابندی میں ہر گام پر معاونت کرتا ہے۔ غالب نے چھوٹی بکروں میں جو غزلیں کہی ہیں وہ میر کے (سے) استفادے کا شعوری نتیجہ ہیں۔ لیکن غالب کی اختراعی طبیعت اور فکری بصیرت نے اس میں تنوعات کی طنائیں کھینچ دیں اور یہاں بھی اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑا۔ لیکن میر کی قادر الکلامی کا اعتراف کیا ہے:

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

"غالب کی عظمت" کے عنوان سے فاضل مقالہ نگار نے ان کی شخصیت کی عقدہ کشائی کے لئے کئی اہم باتیں بیان کی ہیں تاکہ غالب کی شاعری کا قاری کو ادراک ہو سکے مثلاً (۱) اردو شاعری کو نیا حوصلہ عطا کیا (۲) وہ نظام حیات کے نباض اور جہاں دیدہ تھے (۳) ان کے کلام میں ماحول کی عکاسی تھی (۴) غالب ایک بڑے شاعر ہونے کے باوجود انسان بھی تھے جن کے کردار میں خوبیاں اور خامیاں دونوں تھیں (۵) انہوں نے ہمیں نئے خیالات نئے اسلوب اور حکیمانہ نظر دی (۶) غالب کی عظمت کا راز اس بات میں بھی مضمر ہے کہ غالب زندگی کے شدید صدمات اور رنج و الم پر بھی مسکرانے کی جرأت رکھتے تھے غرض غالب ایک ایسے نابغہ تھے جو اپنی فکر و بصیرت میں اپنے عہد سے آگے تھے۔ انہوں نے ماضی سے بھی وابستگی قائم کی تھی لیکن صرف صالح قدروں کے اکتساب کی حد تک، ہم عصر دور میں وہ مومن کی ندرت فکر اور دقت نظر اور شیفتہ کے ذوق شعری عیاں تنقید سے آشنا (آگاہ) تھے۔ فارسی شعرا سے استفادہ اور ان کی قادر الکلامی کے قائل تھے اور وسعت نظر کے لئے بیدل کے معترف۔ غالب نے اسلوب و بیان کے ساتھ ساتھ فکر و فن میں اجتہاد کیا۔ یہی ان کی عظمت کی نشانی ہے۔ جہاں اردو کا

دوسرا شاعر نہیں پہنچتا۔

شائق رنجن بھٹاچاریہ صاحب جن کی اکثر و بیشتر تحریریں بنگال سے متعلق شائع ہو چکی ہیں، انہیں میں ان کی ایک مختصر سی تعریف غالب اور بنگال ہے۔ یہ واقعات کی گفتنی اور غیر مستند باتوں پر مشتمل تحریروں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے فاضل مقالہ نگار کی ادبی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ صرف چند امور کی طرف ذیل میں اشارہ کرتا ہوں۔

(۱) اگر غالب نے کلکتہ کے (۶) کسی مسجد میں نماز ادا کی ہو تو وہ فوجداری بالاخدا مسجد ہی ہو سکتی ہے ۲۵-۲۶ (۲) غالب نے اپنے عہد کے حسن فروشوں کے گھروں کا کلکتہ میں بھی چکر لگایا ہو گا ۲۱ (۳) نیا امام باڑہ بنگلہ جو سر کے دوسری جانب لپ دریا واقع ہے۔ مولوی کرامت علی جو نپوری کے عہد متولی (۶) کے زمانے (۶) میں بنا ۱۰۳۰ پہلی دونوں باتوں کا تعلق بھٹاچاریہ صاحب کا ذہنی مفروضہ ہے۔ اور تیسری بات میں انہیں تسامع موابہ مولوی کرامت علی جو نپوری نے اپنا مذہبی اور اصلاحی مشن مشرق بنگال میں جاری رکھا تھا۔ بنگلی امام باڑے کے متولی دوسرے مولوی کرامت علی تھے۔ جن کا تعلق اثنا عشری طبقے سے تھا ۱۴) بیشتر نے آپ کا نام آغا محمد علی اور بعض بعض نے آغا احمد علی لکھا ہے ۱۵) ایسے لوگوں کی نشاندہی اور کتابوں کا حوالہ ضروری تھا۔ ۵۷) بقول قاضی عبدالودود غالب نے اپنے کسی خط میں اس شاگرد کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن محض اس بنا پر شائق کو شاگردان غالب کی فہرست سے نکال باہر نہیں کیا جاسکتا ۱۳۱۔

بھٹاچاریہ صاحب کو مغالطہ ہوا۔ اسی مقلے کے ابتدائی صفحات میں شائق کے نام غالب کے فارسی خط کا تذکرہ آیا ہے جس میں غالب نے شائق کے فارسی کلام پر اصلاح دی ہے "ماثر غالب" میں شمار نمبر ۳۱ کے تحت صفحہ ۲۸ سے صفحہ ۳۱ تک یہ درج ہے۔

لے غالب اور بنگال "شائق رنجن بھٹاچاریہ (سندھستانی آرٹس پریس ۱۹۹۸ء) بازار اسٹریٹ کلکتہ ۷۳"

(۱) نسخہ کو اس بات کا فخر بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اپنا کچھ کلام مرزا غالب کو دکھایا ہے
 ۱۵۲ء اس کی کوئی سند پیش نہ کی گئی۔ بنگال میں اسلوبِ نثر اور مواد و دونوں اعتبار سے
 یہ کتاب غالب کے شایانِ شان نہیں۔

مولانا ابو محفوظ انکرم معصومی جو مدرّسِ عالیہ کلکتہ میں ایک محدث و مفسر
 ہیں۔ فارسی واردادب کا کئی اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ مولانا کے مقالوں میں کچ کاوی
 محنت و کاوش اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہوتا ہے، وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔
 اسے ہر ممکن ثبوت اور منطقی استدلال کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں غالب
 اور معراج الخیاں پر ایک نظر، کے عنوان سے ان کا ایک مقالہ پیش نظر ہے۔ ”معراج الخیاں“
 میر وزیر علی عبرتی عظیم آبادی کا ایک قلمی تذکرہ جو فارسی شعراء کے حالات پر مشتمل ہے
 عبرتی غالب کے معاصر تھے۔ مولانا کے بیان کے مطابق اس میں کہیں صراحت نہیں ملتی کہ
 غالب اور خواجہ حیدر جان شائق کی ملاقات کہاں ہوئی۔ البتہ اس کا ثبوت ملتا ہے
 کہ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ ”غالب اسم شریف آں نغز کلام“ معنی ”تلاش“ اسد اللہ خان
 است۔۔۔۔۔ از زبان خواجہ حیدر جان مخلص بہ شائق کا از شاگردان عالیِ گفتار باشد شنودیم
 شیخ وجیہ الدین عشقائے ترجمہ سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ شائق عشق کے بھی شاگرد تھے۔
 جس کا کسی اور تذکرہ نگار نے ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ عبارت ملاحظہ ہو: ”من راقم معنی شائب
 را اتفاق دیدن آن مرحوم بجا نگر مگر ڈھاکا پیش کی از مخلصان شیریں زبان خواجہ حیدر جان
 متخلص بہ شائق کا از شاگردان آن نازک تلاش باشد۔۔۔۔۔“ انتادہ ۱۳۰۰ھ

مولانا کا دوسرا مقالہ ”غالب اور مفتی محمدی خادم بردوانی“ بھی قابلِ ذکر
 ہے۔ خادم فارسی کے ایک خوش فکر شاعر تھے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کا فارسی دیوان

لے ماہنامہ ”برہان“ دہلی، اپریل ۱۹۱۶ء - ۱۳۰۰ھ معراج الخیاں ۵۱/ب و ۵۲/۱ -

۱۳۰۰ھ ایضاً : ۲۹/ب لے ماہنامہ ”برہان“ دہلی، مارچ ۱۹۱۶ء

شائع ہوا تھا وہ ہمارا جہیز تھا چند بہادر والی بردوان کا تالیق و استادتھے۔ اور ہمارا جہ اسکو بردوان میں فارسی زبان و ادب کا درس دیتے تھے۔ یہ زمانہ انیسویں صدی کے وسط کا ہے۔ خادم نے غالب کی زمین میں بھی غزل سرائی کی ہے جس سے ان کی قادر الکلامی کا پتا چلتا ہے۔ نشاندہی کے لئے صرف مطلع اور مقطع پیش کیا جاتا ہے :

گر ساختم بمیکدہ مسکن دریں چو بحث : بتیخا شد چو جای برہمن دریں چہ بحث
خادم چہ ہرزہ گوئی غالب کرگفتہ است : عرفی کسی است یک زچوں من دریں چو بحث
دوسری غزل ہے :

دلہم پیرداغ شد در لالہ زارم می توان کشتن

ز گلشن بردن و بر کوہ سارم می توان کشتن

بگریذ تا کسی بر حال من چون غالب ای خادم

جد از خانماں دور از دیارم می توان کشتن

مرزا کی آخری عمر میں خادم کو دہلی میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مرزا کی فرمائش سے اپنی تازہ غزل سنائی۔ اس کے ایک شعر پر مرزانے (غالباً دوسرا) خوش ہو کر بہت داد دی، یہاں چند شعر درج کئے جلتے ہیں۔

کس بآرام نہ از گردش ایام نشست : ہر کس از پیچہ ظلمت بدل چاک نشست
بہر تعظیم خیالش کہ چو آمد ز ادب : اشکم از دیدہ برون آمد بزخاک نشست
خادم ایک دگر از عذرخواہی برخاست : زیر شمشیر تو ای قاتل سفاک نشست
خادم نے بردوان آکر جو غزل مرزا کو بھیجی اس کے دو شعر یہ ہیں۔

ہوای آں حریم جنت آسماں کشد مارا : زیاد صبح میخوایم افزدن تیزی پارا
فضای دہلی و گلگشت باغ و سیر بازارش : چو در دل یاد آید خادم از جامی برد مارا
مولانا معصومی صاحب کا ایک اور پرغز مقالہ ”مرزا غالب اور مددگار کمپنی“

میں تمام معاصر اور متداول حوالوں سے کلکتہ میں مشاعرے کی جگہ کا تعین کیا گیا ہے۔ جس میں غالب نے شرکت کی تھی۔ بقول غالب معصومی صاحب کے بیان کا خلاصہ یہ ہے (۱) مشاعرہ ہر انگریزی جیسے پہلے اتوار کو ہوتا تھا (۲) نشست مدرسہ سرکار کلبجی میں ہوتی تھی (۳) مشاعرے میں اردو فارسی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ (۴) جس مجلس میں غالب شرکت ہوئے اس میں سفیر ہرات بھی تھے (۵) سفیر ہرات نے غالب کے کلام کی جی کھول کر داد دی۔ (۶) مقامی شعرا کے کلام پر سفیر زبیر لب مسکراتے رہے (۷) مقامی شعرا کو خفت اٹھانی پڑی جس کے نتیجے میں غالب ہدف اعتراض بنائے گئے (۸) اعتراض غالب کے دو شعر پر کئے گئے۔ (۹) غالب کی حمایت میں نواب اکبر علی خاں اور مولوی محمد حسن نے جوابات دیئے (۱۰) مشاعرے میں پانچ ہزار کا جمع تھا۔

غالب کے بعد ان کے معاصر وزیر علی جوہری کے دو تذکرے ”معراج الخیال“ اور ”ریاض الافکار“ کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) امان علی خان نے برسر مشاعرہ غالب پر اعتراض کیا تھا (۲) معترضین بد مذاق اور حاسد تھے اس پر مولانا کا یہ خیال کہ لغاوت سن و سال اور مرزے کے بلند آہنگ دعووں کو بھی ہنگامہ برپا کرنے میں بنیادی حیثیت رہی ہے۔ جمید احمد خان صاحب نے اپنے مضمون میں مدرسہ کلکتہ سے یہی مدرسہ مراد لیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ”مدرسہ اپنی موجودہ عمارت میں سن ۱۸۷۱ء یا سن ۱۸۷۲ء کے قریب منتقل ہوا۔“ غالب کو مشنوی بادِ مخالف والا ہنگامہ مدرسہ کی پہلی عمارت میں پیش آیا جو سیالہ میں بیٹھک خاں روڈ پر تھی۔“ انہوں نے مدرسہ عالیہ کے پرنسپل مولانا محمد موسیٰ کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ جو مشاعرے ۱۹۲۵ء-۱۹۲۶ء میں ہوئے ان کا ذکر مدرسہ کے کاغذات میں نہیں ملتا۔“ یادگار غالب“ میں مولانا حاکمی نے قیام

سے رسالہ برہان، دہلی، اکتوبر ۱۹۷۲ء

۱۲ غالب کا کلکتہ، مطبوعہ ماہ نوکراچی، فروری ۱۹۵۷ء

کلکتہ کی سرگزشت میں اس ہنگامے کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ مدرسہ عالیہ کے ذکر سے خالی ہے۔ (۱۵-۲۰)

مدرسہ سرکار کمپنی 'مدرسہ عالیہ' یا مدرسہ عالی کا اطلاق صرف موجودہ مدرسہ عالیہ یا محمد ن کالج پر نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بیٹھک خانہ روڈ یا ویلز لی اسکولز کے مدرسہ عالیہ کے علاوہ فورٹ ولیم کالج پر بھی ہوتا تھا۔ ثبوت میں اس کالج کی مطبوعات اور خطوطات پیش کئے جاسکتے ہیں اگر غالب کے مدرسہ سرکار کمپنی سے فورٹ ولیم کالج مراد میں تو تمام قرائن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کالج کی روایات میں مشاعرہ شامل رہا ہے۔ یہ مشاعرہ ہر سال بڑے اہتمام کے ساتھ ۲۵ جولائی کو منعقد ہوتا تھا۔ سالانہ مشاعرے کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کالج سے مسلک حلقہ شعراء کے اہتمام میں ہر چھپنے مشاعرہ ہوتا ہوگا اور یہ سلسلہ غالب کے قیام کلکتہ کے زمانے تک باقی رہا۔ مزید یہ کہ ہر انگریزی چھپنے کے پہلے اتوار کو بزم سخن کا آراستہ کیا جانا کسی مدرسے کے علماء اور اصحاب فن کے معرپہ ماحول اور دینی مذاق کے منافی ہے۔ مدرسہ عالیہ میں جموع کے علاوہ ہر روز بشمول یک شنبہ تعلیم ہوتی تھی۔ مدرسے کا اسٹاف کل پانچ استاد، ایک خطیب اور ایک مؤذن پر مشتمل تھا۔ ایسی صورت میں ایک بڑے مشاعرے کا اہتمام ممکن نہ تھا بقول غالب پانچ ہزار کا مجمع تھا۔ موجودہ مدرسے کا اندرونی حصہ اس مجمع کے لئے ناکافی تھا، یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ غالب نے کلکتہ کا سفر جس مقصد کے لئے کیا تھا اس کی تکمیل میں کلیمانی فورٹ ولیم کالج کے ارباب علم و ادب کے ذریعہ ہی ممکن تھی۔ اور یہ کہ مشنری باورخاں کے نسخے جن لوگوں کو بھیجے گئے تھے ان کا تعلق مدرسہ عالیہ کے بجائے فورٹ ولیم کالج سے تھا۔ مولانا معصومی کے مذکورہ استدلال سے انکار و انحراف کی گنجائش نہیں۔

جناب سید لطیف الرحمن مدرسہ عالیہ (کلکتہ) کے اینگلو پریشین سیکشن کے سابق
 اساتذہ نے ”غالب اور ان کے معترضین“ کے عنوان سے مستقل ایک کتاب غالب کے صد سالہ
 جشن کے موقع پر شائع کی تھی۔ اس میں دوسرا اور پانچواں باب غالب کی فارسی اور اردو
 شاعری پر ہے۔ غالب اپنے فارسی دیوان کو آسمانی صحیفے کی حیثیت دیتے ہیں۔ لیکن اردو
 میں ان کی شاعری کا پہلا دور ناکامی کا دور تھا اور دوسرا دور کامیابی و مقبولیت کا۔
 فاضل مقالہ نگار نے فارسی و اردو دونوں شاعری میں غالب کے معاصرین اور موجودہ
 ناقدین کی رائے ان سے متعلق جمع کر دی ہیں اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ ان کا ذہن خلافتِ قاد
 اور ان کے نکر و فن میں بالیدگی اور بختگی ہے لیکن قدیم فارسی اور اردو شعرا کے کلام کی
 روشنی میں ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو وہ دوسروں کے کلام سے استفاد اور مسخوذ
 معلوم ہوتا ہے اس کتاب کا تیسرا مضمون ”غالب کی فلسفی دانی“ ہے۔ اس میں بتایا گیا
 ہے کہ غالب امیر خسرو کے علاوہ کسی ہندوستانی شاعر کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً
 مرزا محمد حسن قنبل کو ”کھتری بچہ“ اور ناشائستہ الفاظ سے یاد کرتے تھے قنبل اور غیاث الدین
 کو ”خران نام شخص“ کہتے تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں: ”وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں
 کی جمہ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں“۔ سلا عبد السمیع کو اپنا
 استاد مانتے تھے۔ اگرچہ اس کا خارجی وجود مشکوک ہے انہوں نے اپنے فارسی دیوان کی
 تقریظ میں عبد السمیع کا نام تو کیا اس طرف اشارہ تک نہ کیا۔ اپنے متعلق فرماتے تھے:
 ”بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے...“ میرے مورث اعلیٰ ترک تھے اور ان کی زبان
 ترکی تھی۔ محمد حسین تبریزی (مولف برہان قاطع) کو حقارت سے دکنی کہتے ہیں۔ فاضل مقالہ
 نگار نے اس کا دلچسپ جواب دیا ہے کہ اگر ایک ہندوستانی تبریزی زادہ فارسی داں نہیں
 ہو سکتا تو ایک ہندوستانی ترک زادہ کیونکر فارسی داں ہو سکتا ہے۔

پنشن کے سلسلے میں غالب کے کلکتہ پہنچنے سے قبل ان کے بہنوئی کے بھائی

افضل بیگ (وکیل بادشاہ دہلی) نے غالب کے خلاف فضا مسموم کر رکھی تھی کہ وہ رافضی اور ملحد ہیں۔ قلیل کو برا کہتے ہیں اور شعرائے کلکتہ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کے اعزاز میں پہلا مشاعرہ ۸ جون اتوار کو کلکتہ مدرسہ میں ہوا اور انہوں نے فارسی وارد دو دونوں طرحوں میں غزلیں پڑھیں۔ تذلیل کے بدلے عزت افزائی ہوئی لیکن غزلوں کی نشاندہی نہ کی گئی۔ اسی مدرسے میں دوسرا مشاعرہ ہوا۔ پانچ ہزار کا مجمع تھا۔ غالب نے نو شعر کی غزل پڑھی۔ اس شعر پر تین اعتراض ہوئے۔

جزیے از عالم داز ہمہ عالم بیشم : ہمجو موئے کہ بتاں راز میاں بر خیزد
 پہلایہ کہ "بیش" کی جگہ "بیشتر" ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ "موئے" زمیاں بر خیزد غلط ہے۔ بلکہ پورا شعر بے معنی ہے "تیسرا یہ کہ "عالم" مفرد ہے، اس کے ساتھ "ہمہ" کا استعمال درست نہیں۔ معترضین میں مولوی وجاہت علی نکلنوی، احمد علی گوبامٹوی، مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی عبدالقادر رامپوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی تھے تیسرے اعتراض کا جواب نواب علی اکبر خاں اور مولوی محمد حسن (ممن اپنے ہم عصر مشاعرہ دیا اور سند میں حافظ و سعدی کے اشعار پیش کئے) تعجب ہے کہ غالب نے دو اعتراضوں کے جواب کا اپنے کسی خط میں تذکرہ نہیں کیا۔ غالب نے اعتراضوں کا جواب دینے کے بجائے یہ فرمایا: "کون قلیل؟ کون قلیل؟ دہلی فرید آباد کا کھتری بچہ! میں اس فرومایہ کو کیوں سزا دے لگا۔" قلیل کے معقدین کی اچھی خاصی تعداد تھی، غالب کے طرز عمل سے افضل بیگ کے پر دو پگندے کی حقیقت ثابت ہو گئی۔ تیسرے مشاعرے میں غالب نے جو غزل پیش کی اس کے ایک شعر پر اعتراض ہوا کہ "زدہ" میں اضافت کیسی؟ غالب نے "مثنوی باد مخالف" میں جواب دیا ہے کہ "زدہ" میں کسرہ "یائے وحدت" کی علامت ہے۔ شعر یہ ہے شورائے بشارت بن مرزاں دارم : طعنہ بر بے سرو سامانی طوفان زدہ

علہ مقالہ نگار کے بقول غالب خود کون سے شیراز یا اصفہان کے ایرانی بچے تھے ص ۱۰۲ گویا فارسی زبان کا مستند فارسی دان ہونے کے لئے اگر کے ہندوستانی باپ کا ترک بچہ ہونا ضروری ہے خط

غالب نے تیسرے مشاعرے میں پہلے اعتراضات کا جواب دینا چاہا اور دلی ہرات کے سفیر کفایت خان نے ان کی تحسین اور مدافعت کی لیکن کفایت خان سے متعلق چند مختلف خطوط میں ان کے مختلف بیانات ملتے ہیں اس لئے ان کی شخصیت غالب کے ذہن کی تخلیق معلوم ہو رہی ہے۔ غالب کے اعزاز میں تین مشاعرے کی کسی اور ذریعہ سے تصدیق نہیں ہوئی۔ غالب نے نواب علی اکبر کے مشورے پر ایک مثنوی "اشتی نامہ" (باد مخالف) لکھی جس کا مقصد اہل کلکتہ سے صلح جوئی تھا تاکہ ان کے خلاف بھڑکتی ہوئی آگ سرد ہو جائے۔ مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ کلکتہ کے علاوہ ہندو پاک میں فارسی کے دانشمندیوں اور شاعروں نے غالب کے کلام پر اعتراضات کیے ہیں جس سے اس کا پتا چلتا ہے کہ غالب کی فارسی دانی قابل تقلید نہیں۔ ہاں اس کلکتہ میں رضا علی وحشت جیسا غالب کا مقلد پیدا ہوا جس نے مدتوں ان کے انداز بیان اور رنگ سخن کو زندہ رکھا۔

اس کتاب کا چوتھا باب "قاطع برہان کا ہنگامہ" کے عنوان سے بہت دلچسپ ہے۔ محمد حسین ابن خلف تبریزی کی فرہنگ "برہان قاطع" کے خلاف غالب نے "قاطع برہان" میں ایک سو ساٹھ اعتراض کئے ہیں جن میں ایک سو تیس غلط ہیں۔ اس کے علاوہ غالب ہندوستان کے فرہنگ نویسوں کو غیر مستند سمجھتے تھے اور محمد حسین تبریزی کو حقارت آمیز لہجے میں "دکنی" لکھتے تھے۔ غالب کے خلاف اس سلسلے میں تمام ہندوستان میں کتابیں لکھی گئیں، پھر غالب کے طرف داروں نے اس کا جواب دیا۔ آخری کتاب آغا احمد اصفہانی جہانگیر آبادی نے "مؤید برہان" لکھی جس میں دس بارہ کے علاوہ غالب کے تمام اعتراضات کا مدلل جواب تھا غالب نے یہ کتاب دیکھے بغیر اصفہانی کے خلاف ایک اہانت آمیز قطعہ لکھا کہ انہیں بھیج دیا۔ اس پر غالب اور اصفہانی کے شاگردوں میں منظوم مبارزہ شروع ہو گیا۔ پھر غالب اور اصفہانی کے درمیان بھی کتابی صورت میں اعتراض و جواب کا سلسلہ رہا۔ مقالہ نگار نے ان تمام کتابوں اور ان کے مصنفین کی تفصیل بیان کی جس کا مطالعہ معلومات افزا اور عبرت آموز ہے۔

اس لئے کہ پڑھے لکھے لوگوں نے کیسی کیسی گندی گالیاں دی ہیں۔ آخر مولوی امین کی کتاب "قاطع القاطع" کی نفی نگاری کے خلاف غالب نے مقدمہ دائر کر دیا۔ لیکن کچھ سنجیدہ لوگوں کی مداخلت کی بنا پر مباحثت ہو گئی۔ اس کے بعد برہان قاطع "اور قاطع برہان" پر مختلف لوگوں کی رائیں نقل کی گئی ہیں۔ آخر میں یہ کہنا ہے چاہے ہو گا کہ پوری کتاب میں مصنف کا انداز بیان غالب کے ساتھ معاندانہ نہیں تو منعقاد بھی نہیں ہے۔

لطیف الرحمن صاحب کا ایک کتابچہ بھی "غالب سرائی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ جس میں غالب کی تعریف میں رہا حیاں ہیں۔

استاد مکرم ڈاکٹر شوکت سبزواری مشرقی زبانوں کے فاضل غالبیات کے محقق اور لسانیات کے ماہر تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں کئی برس درس و تدریس کے بعد "اردو لغت بورڈ" میں مدیر کی حیثیت پر تشریف لے گئے۔ ان کی کتاب "غالب" فکر و فن " میں سات مقالے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ پہلا مقالہ "غالب محقق کی حیثیت سے" ۱۲۸ صفحے پر مشتمل ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے علی گڑھ میگزین (غالب نمبر ۱) میں "غالب بحیثیت محقق" کے عنوان سے ایک مقالہ سیر قلم کیا تھا۔ اس میں غالب کی لغوی، ادبی، فنی، تاریخی اور مذہبی معلومات کا جائزہ لیا ہے۔ قاضی صاحب کو اصرار ہے کہ "غالب شاعر، انشا پر داز اور ادیب تھے۔ زبان دانی اور تحقیق لغات سے ان کو کیا تعلق؟ ان کے ہم عصر اور پیش رو سبھی ہندوستانی فارسی دان، فارسی دانی میں ان سے ہمراہ بہتر ہیں۔ سبزواری صاحب نے ان اعتراضات کا حسب ذیل تین حصوں میں جائزہ لیا ہے۔ (الف) ایران قدیم کی زبان نامذہب اور تاریخ سے غالب کی واقفیت (ب) غالب کی زبان دانی اور فارسی ادب، فن اور شعر سے باخبری (ج) غالب کی معلومات عامہ۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قاضی صاحب کے تمام اعتراضات صحیح نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سبزواری صاحب کے مقالے کی اشاعت کے بعد

لے مطبوعہ کل پاکستان انجمن ترقی اردو (کراچی) ۱۹۶۱ء) لے علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) ۱۷۷

قاضی صاحب نے اس کی روشنی میں اپنے مضمون پر نظر ثانی کی اور ترمیم و ترمیم کے بعد دوبارہ نقد غالبؔ میں اے شائع کرایا۔ سبزواری صاحب کی دقیق اور بصیرت افرور بحث کو سمجھنے کے لئے علمی استعداد اور صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔

”ذال بمعجم فارسی میں“ اس کتاب کا دوسرا مقالہ ہے، وہ فرماتے ہیں کہ فارسی زبان اور لغت کی باریکیوں پر غالب کو جو کمال حاصل تھا اے ان کی شاعری نے چمکنے نہ دیا۔ غالبؔ کے زمانے میں گزشتن، پیر رفیق و غیر الفاظ کو ”ذ“ سے لکھا جاتا تھا۔ غالبؔ نے اعتراض کیا کہ ”ذال“ عربی ہے اس لئے ”زے“ سے لکھنا درست ہے۔ غالبؔ کے خلاف ہنگامہ ہوا لیکن وہ اس کا ثبوت نہ دے سکے اس لئے کہ محقق نہ تھے۔ برصغیر کے قابل احترام محقق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے غالبؔ کی اس تحقیق کو غلط قرار دیا۔ ڈاکٹر سبزواری نے غالبؔ کی موافقت میں سنسکرت اوستا پہلوی، قدیم فارسی کی گرامر اور ایرانی و غیر ایرانی ماہرین لسانیات کی تحریر سے یہ ثابت کیلئے کہ ”ذال“ کا وجود فارسی میں نہیں، اس لئے غالبؔ کا خیال درست ہے۔ پورا مقالہ لسانیات کے دقیق مباحث پر مشتمل ہے اس لئے اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر سبزواری کا تیسرا مقالہ ”میر و غالبؔ“ ہے۔ دراصل سبزواری صاحب کی کتاب ”فلسفہ کلام غالبؔ“ پر اثر کھنڈی کے طویل تبصرے کا جواب ہے۔ اس تبصرے میں اثر صاحب نے میرؔ کو غالبؔ پر ترجیح دی ہے، یہی سدا اختلاف کا سبب ہے۔ سبزواری صاحب نے مختلف مثالوں سے یہ ثابت کیلئے کہ شعر کے لئے سوز درد کا رہے۔ اور فلسفے کے لئے فکر و نظر۔ سوز و فکر کے امتزاج سے فلسفیانہ شاعری وجود میں آتی ہے۔ غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا انحصار فلسفیانہ فکر و نظر اور شاعرانہ سوز و ساز پر ہے، وہ میرؔ کو بھی ایک عظیم شاعر مانتے ہیں لیکن غالبؔ پر ترجیح نہیں دیتے۔ اس کتاب کا چوتھا مقالہ ”غالبؔ اور میرؔ“ کے عنوان سے بہت سارے تاریخی اور ادبی مباحث ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ یعنی غالبؔ کے اردو خطوط کا پہلا مجموعہ ”عود ہندی“ منشی

نے خطوط غالبؔ، مرتبہ، ہمیش برشار

ممتاز علی خان کے زیر اہتمام مطبع مجتہائی میرٹھ سے شائع ہوا (۱۸۶۸ء) میرٹھ ہی کے ایک سخن فہم منشی احمد حسن شوکت نے غالب کے اردو دیوان کی مکمل اور جامع شرح لکھی۔ میرٹھ میں غالب کے تین قابل فخر شاگرد تھے۔ شیخہ، اسماعیل میرٹھی اور حکیم فصیح الدین رنج، رنج نے شاعرات کا ایک تذکرہ ۱۸۶۴ء میں میرٹھ سے شائع کیا۔ غالب نے کم سے کم تین مرتبہ میرٹھ کا سفر کیا اور شیخہ کے مہمان رہے۔ غالب نے برہان قاطع کی تردید میں "قاطع القاطع" شایع کی تو مرزا رحیم بیگ میرٹھی نے اس کے جواب میں "ساطع برہان" لکھی۔ ان کی یادگار سے "مخزن الشعراء" ایک تذکرہ بھی ہے۔ میرٹھ میں غالب کے کئی احباب بھی تھے مثلاً منشی ممتاز علی خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیخہ منشی غلام بسم اللہ، حکیم غلام مولا تعلق اور حکیم محب علی نیر۔

اس کتاب کا پانچواں مقالہ "غالب کے اردو کلام کی اشاعت" سے متعلق ہے، اس میں غالب کے اردو کلام کی پانچ اشاعتوں سے بحث کی گئی ہے، پہلی اشاعت ۱۸۶۸ء میں سید المطابع دہلی سے ہوئی اور دوسری اشاعت ۱۸۶۸ء میں مطبع دارالاسلام دہلی سے، اس میں وہ اشعار بھی اضافہ کر دیئے ہیں جو اس چھ سالہ عرصے میں غالب نے کہے تھے۔ کلام غالب کی تیسری اشاعت مطبع احمدی شاہدہ دہلی سے ۱۸۷۰ء میں ہوئی۔ یہ کسی قدر مکمل بھی ہے اور اہم بھی۔ مکمل یوں کہ اس میں ۱۸۰ کے قریب اشعار ہیں، اور اہم اس لئے کہ بعد کے ایڈیشن اسی پر مبنی ہیں۔ دیوان غالب چوتھی بار ۱۸۷۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا اور پانچویں بار مطبع مفید الخلاق اگرہ سے ۱۸۷۳ء میں یعنی غالب کی وفات سے چھ سال پہلے۔ اس کتاب کے آخری دو مقالے "غالب کی شخصیت" اور "غالب خطو کے نمونے میں" مختصر ہیں، مگر بقول مصنف ان میں مراحت کے ساتھ اور براہ راست غالب کی شخصیت اور اس کی بیرونی کردار کے نمایاں پہلو دکھائے گئے ہیں۔

کلیں سسرانی نے غالب اور بنگال پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی مثال یہ کتاب ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اس باب میں خود ہی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

لے سہوکتا بت ہے، "قاطع برہان" ہونا چاہیے

غالب کے ایک حریف

غالب کے ایک حریف سے میری مراد آقا احمد علی اصفہانی کی شخصیت ہے جہانگیر نگر یعنی ڈھاکے کو ان کی ولادت کا شرف حاصل ہے۔ جہاں وہ دسویں شوال ۱۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام ”مظہر علی“ ہے جس سے ۱۲۵۵ھ تکلتے ہیں۔ یہ ایرانی خاندان اصفہان سے ہجرت کر کے نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آیا اور بنگال کو اپنا وطن بنایا۔ اس لئے احمد علی اپنے آپ کو اصفہانی لکھتے ہیں۔ لیکن بعض انہیں جہانگیر نگر کی مناسبت سے جہانگیر نگری لکھتے ہیں۔ آقا احمد علی کے والد کا نام آقا شجاعت علی اور دادا کا نام آقا عبد العلی تھا۔ ان کے دادا کا شمار اپنے عہد کے مشہور خوشنویسوں میں ہوتا تھا۔ آقا احمد علی نے عربی اور فارسی کی تعلیم ڈھاکے کے صاحب استعداد اور قادر الکلام شاعر خواجہ اسد اللہ کو کتب سے حاصل کی۔ آقا احمد علی کو مولانا حالی نے احمد علی بیگت اور قاضی احمد میاں اختر جو نادر دہلی نے پروفیسر مگلی کالج لکھا ہے جو درست نہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں کلکتہ مرکز علم و ادب تھا اور نسبتاً ڈھاکے سے زیادہ وہاں فارسی کا چرچا تھا۔ اس لئے احمد علی اصفہانی ۱۸۶۲ء میں ڈھاکے سے کلکتہ منتقل ہو گئے اور اپنے نام کی مناسبت سے وہاں ”مدرسہ احمدیہ“ کی بنیاد رکھی۔ اور وہیں تعلیم و تدریس کے مشاغل میں منہمک ہو گئے۔ ۱۸۶۲ء میں پروفیسر کاؤل (COWELL) کی سفارش پر مدرسہ عالیہ کلکتہ

یعنی کلکتہ مدر سے میں بحیثیت مدرس فارسی ان کا تقرر ہو گیا۔ وہ ایسا ملک سوسائٹی بنگال (کلکتہ) کی عربی فارسی مطبوعات کے ایڈیٹر بھی تھے۔ انہیں فارسی زبان و ادب پر خصوصیت کے ساتھ جیسا عبور حاصل تھا اس کا اندازہ لگانا ان کی تصانیف ہفت آسمان، ترانہ، اشتقاق، مویذ بہرمان اور شمشیر تیز تر وغیرہ سے مشکل نہیں۔ ان کے علاوہ آقا احمد علی نے منتخب التواریخ، اکبر نامہ، سکندر نامہ بکری، اقبال نامہ جہانگیری، مآثر عالمگیری اور دیس و رامین کی بھی تصحیح کی۔ جو ایسا ملک سوسائٹی بنگال کی طرف سے شائع ہوئی۔ بقول بلاخسن، آقا احمد علی اصفہانی کا انتقال بخار کے عارضے میں چھٹی ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ (مطابق جون ۱۸۷۳ء) کو دھاکے میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۳۵ سال تھی گویا غالب کے مقابلے میں عمر کے لحاظ سے نوجوان تھے۔ عبدالغفور نساخ نے 'واصل حق آقا احمد' تاریخ وفات کہی جس سے ۱۲۹۰ھ ق نکلے ہیں۔ ان دونوں حضرات کے بیان میں اختلاف نہیں لیکن بلاخسن کا بیان وضع معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس نے سنہ ہجری و عیسوی کے ساتھ ساتھ جیسے اور تاریخ کا بھی تعین کیا ہے۔

غالب کی عہد آفرین شخصیت اور شاعرانہ عظمت اپنی جگہ مسلم لیکن آقا احمد علی اصفہانی کی علمیت و صلاحیت، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی، فارسی دانی اور حقیقی مویشگافی، علم عروض پر قدرت اور مطالعے کی وسعت سے انکار ممکن نہیں۔ دھاکے کے دو ممتاز اہل قلم یعنی غالب معتمد معاصر نواب سید محمود آزاد جہانگیر نگری اور ان کے چھوٹے بھائی سید محمد آزاد (آودھ پنچ کے نورتن) احمد علی اصفہانی ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ اور مشہور مستشرق بلاخسن بھی انہیں کے شاگرد تھے۔ آقا صاحب عبدالغفور نساخ ہم عصر وہم مذاق تھے۔ ممکن ہے کہ ان تمام اہلیتوں کے باوجود آقا احمد علی کو محمد ود علی طبقہ ہی جانتا ہو۔ لیکن مرزا غالب کے ساتھ ان کی علمی معرکہ آرائی نے انہیں ہندوستان کی گہر شہرت اور اہمیت بخشی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران جب مرزا غالب تقریباً گوشہ نشین ہو چکے تھے، انہیں مرزا محمد حسین تبریزی کے فارسی لغت برہان قاطع کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس میں بعض اغلاط نظر آئے۔ چنانچہ ان اغلاط کو کتابی صورت میں مرتب کر کے اس کا نام قاطع برہان رکھا۔ چند سال بعد ۱۸۶۵ء میں تصحیح و اضافے کے ساتھ اس کی دوسری اشاعت ررفش کاویانی کے نام سے شائع ہوئی۔ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی ”برہان قاطع“ میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزار ہا لغت غلط، ہزار بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادرم ہوا۔ میں نے سود و سول لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اس کا نام رکھا ہے نیلے“

اس میں شک نہیں کہ مرزا غالب کو فارسی زبان و ادب پر بڑا عبور تھا۔ اس باب میں نفس مطمئنہ بھی حاصل تھا اس لئے قاطع برہان کی ترتیب و تدوین میں انہوں نے فرسنگوں سے مدد لینے کی بجائے اپنے ذوق و ذہن اور مذاق و اجتہاد پر اعتماد کیا۔ منشی ہرگوپال لختہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

فارسی میں مبدا و فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے اور اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جا گزیں ہیں جیسے قولاد میں جوہر۔ اہل فارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا ہندوستان، دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو دسویں چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں الیہ“

غالب کی قاطع برہان ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی۔ انداز تحریر جابجا شوخ اور اس میں ہندی نثر ادب و لغت نویسوں کا حقارت آمیز طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے غالب کے خلاف مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ مخالفت کلکتہ تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا^{۱۲} اور ۱۰۹ دونوں ملک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اور موافق و مخالف محاذوں سے مختلف تحریریں وجود میں آئیں۔

جوابی کتابیں

نامہ غالب (از غالب)

دافع ہذیان (از مولوی نجف علی)

لٹائن غیبی (از میاں داد سیاح)

در اصل بر بقلم غالب)

سوالات عبدالکریم (از مولوی عبدالکریم)

در اصل بر قلم غالب)

قطعہ فارسی ریخ تیز (از مرزا غالب)

مخالف کتابیں

۱۔ ساطع برہان (از مرزا جیم بیگ میرٹھی)

۲۔ قاطع القاطع (از امین الدین دہلوی)

۳۔ محرق برہان (از مولوی سعادت علی)

۴۔ مؤید برہان (از آقا احمد علی اصفہانی)

۵۔ تیغ تیز تر (از فدا سہٹی)

ہنگامہ دل آشوب، حصہ اول و دوم

(از باقر علی باقراروی و فتح الدین فیضی دہلوی)

۶۔ شمشیر تیز تر (از آقا احمد علی اصفہانی)

ان تمام مذکورہ کتابوں پر تنقید و تبصرہ میرے موضوع سے خارج ہے لیکن کم از کم ان کتابوں کے مصنفوں کے سرسری تذکرے سے اس ادبی نزاع کا خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔

البتہ اس سلسلے کی اہم اور قابل قدر کتاب آقا احمد علی کی "مؤید برہان" ہے جسے انکا اشاء کا

سمجھنا چاہیے۔ ”مؤید برہان“ محمد حسین ابن خلف تبریزی کی ”برہان قاطع“ کی تائید میں لکھی گئی اور مطبع مظہر العجاائب کلکتہ سے ۱۲۸۲ھ ق (مطابق ۱۸۶۶ء) میں شائع ہوئی یہ کتاب اردو ٹائپ میں ہے۔ اور اس کی صفحہ امت پونے پانچ سو صفحے ہے مولوی احمد علی نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں ایسا ملک موسائٹی بنگال کا پورا کتب خانہ کنگال ڈالا اور جس کاوش سے تحقیق کا حق ادا کیا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ تمام ناقدین اور غالب کے معقدین و موافقین بھی اس کی عظمت و اہمیت کے معترف ہیں۔

غالب نے اپنی کتاب ”قاطع برہان“ کو سمجھنے کے لئے جو معیار قائم کیا ہے اس کی وضاحت میر ہمدی مجروح کے نام ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

”یہ یاد رہے کہ جو صاحب اس کو دیکھیں گے، ہرگز نہ سمجھیں گے۔“

صرف برہان قاطع کے نام پر جان دین گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں، وہ اس کو ملنے لگا، پہلے تو عالم ہو، دوسرے فن لغت

جاننا ہو، تیسرے فارسی کا علم ہو اور اس زبان سے اس کو لگاؤ ہو،

اساتذہ سلف کا کلام بھی بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد بھی ہو، چوتھے

منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو، پانچویں طبع سلیم اور ذہن مستقیم

رکھتا ہو، معوج الذہن اور کچھ فہم نہ ہو۔ یہ پانچ باتیں کسی میں (نہ)

جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔

اگر انصاف کی روشنی میں غالب کے مجوزہ معیار کا جائزہ لیا جائے تو بجا طور پر

کہا جا سکتا ہے کہ آغا احمد علی اصفہانی میں یہ پانچوں باتیں موجود تھیں اور وہ غالب

کی قاطع برہان کو سمجھنے کے قابل بھی تھے۔ مرزا کا یہ مفروضہ کہ یہ پانچوں باتیں (نہ) کسی میں جمع ہوں

گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔“ یا بلندی معیار کا تقاضا، ان کے اپنے دماغ

کی اختراع تھا جس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ وہ احساس برتری میں مبتلا تھے۔

مزید یہ کہ کلکتے کے دوران قیام ۱۸۲۸ء میں جو ادبی حادثہ مرزا کے ساتھ پیش آیا تھا اس کی بنیاد برنگال والوں کے خلاف ان کے مزاج میں ایک تلخی سی پیدا ہو گئی تھی اس لئے مؤید برہان کی اشاعت کی اطلاع ملتے ہی اس کے مطالعے اور محاسن و معائب کا اندازہ لگائے بغیر مرزا غالب نے آقا احمد علی اصفہانی کے خلاف ایک طویل قطعہ لکھ کر انہیں بھیج دیا۔ اور ایک ایسے نزع کی بنیاد رکھ دی جس کی تلافی اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے نہ کر سکے۔ مرزا غالب میر حبیب اللہ زکا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ایک دوست نے کلکتہ سے اطلاع دی ہے کہ مولوی احمد علی مدرس

مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے اس کا نام مؤید برہان ہے۔
اس رسالے کے فوج کئے میں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی (محمد حسین تبریزی) پر کئے ہیں اور تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کئے ہیں اور اہل مدبرہ اور شعراء کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم سے لکھی ہیں بس بھائی میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر بھیج دیا اور کئی ورق اس دوست کو اور دو چار جلدیں ”درفش کاویانی“ علاوہ اور اق مذکور بھیج دیے لہذا اس قطعے کے چند شعروں سے غالب کالب دلہجہ ملاحظہ فرمائیے۔

مولوی احمد علی احمد مختص نسخہ	در خصوص گفتگوئی پارس انشا کرد است
در جہاں توام پور روی دی دشت قتل	پیشوای خویش سند زادہ را کرده است
خواجہ راز اصفہانی بودن آباچہ سود	خالقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است
صاحب علم و ادب و نگہ ز افراط غضب	چو سفہاں دفتر نفیس و دم واکرہ است
زشت گنتہ یک را بد نہ سخی دادہ ام	شوخی طبع کہ دارم اس تقاضا کردہ است
انتقام جامع برہان قاطع“ می شد	آپ مرا کہیم باوے خواجہ باما کردہ است

یہاں تیسرے شعر کا دوسرا مصرع توجہ طلب ہے، غالب فرماتے ہیں :

”خالقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است“ یعنی احمد علی اصفہانی کی پیدائش ملک بنگال میں ہوئی۔ فارسی میں لفظ ”پیدا“ تولد یا پیدائش کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ظاہر یا دستیاب کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب کے مافی الضمیر کی وضاحت کے لئے فارسی میں آفریدن، خلق کردن اور بوجود آوردن عام طور پر مستعمل ہے۔ غالب سے یہ تسامع غالباً اردو کے زیر اثر ہوا ہے۔

اس قطعے کے بارے میں جناب سید قدرت نقوی فرماتے ہیں ”در حقیقت مؤید برہان جیسی کئی کتابیں بھی حسن تاثیر میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں“^{۱۸} ”تخلیق و تحقیق دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان میں قدر مشترک کی تلاش اور مقابلہ مناسب نہیں۔ پھر یہ کہ یہ قطعہ غالب کی کوئی اہم تخلیق نہیں اور نہ اس کا تعلق حسن سے ہے اور نہ تاثیر سے۔ بلکہ ادبی نزاع کی حقیقت کا اظہار ہے۔“

مرزا غالب کا یہ استدلال کہ مولوی احمد علی کے آباؤ اجداد اصفہانی تھے لیکن ان کی پیدائش بنگال میں ہوئی۔ اس لئے فارسی زبان پر فخر و ناز کرنا ان کے لئے بجا نہیں۔ کون جانتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں جب بنگال میں فارسی زبان وادب کا چرچا تھا، احمد علی اصفہانی کے گھر میں فارسی ہی بولی جاتی ہو، کیونکہ آج بھی ایک سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد ڈھاکے میں ایرانی الاصل خاندان مثلاً شیرازی، اصفہانی اور محمد حسینی دالان کے ایرانی خاندان کے بعض افراد آپس میں فارسی بولتے ہیں نامہ غالب (ربن نام مرزا جیم گیک) میں غالب فرماتے ہیں :

”اگر کوئی مجھ سے کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے میری طرف

سے جواب یہ ہے کہ ہندو مولد اور فارسی زبان ہئے“

ہرچہ از دستگہ پارس بریغما بردند
 تا بنیالم، ہم از ان جملہ زبانم دادند
 زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور عطیہ خاص بنیانب اللہ
 ہے۔ فارسی زبان کا مسلک مجھ کو خدا نے دیلے، مشق کا کمال میں نے
 استاد سے حاصل کیا ہے۔“

غالب کے مذکورہ بالا قطعے کے جواب میں آقا احمد علی اصفہانی کے شاگرد مولوی
 عبدالصمد فدا سلہٹی نے ایک طویل قطعہ کہا اور بحث کا سلسلہ نثر سے نظم کی
 طرف منتقل ہو گیا۔ فدا کے قطعے سے چند اشعار درج ہیں۔

دید چوں غالب ”موید“ آں کتاب لاجواب کش بعد تحقیق املا ہادی ما کردہ است
 گفتگو بالای طاق از اصل مضمون کتاب ہرزہ گوئی ہرچہ دارد بے حجاب کردہ است
 من یکم بہ عبدالصمد در شعر نام من فدا شہر سلہٹ مولد از بدعتی کردہ است
 من یکے از کمترین خدام آقا احمد چوں بدیدم معترض این شکوہ بی کردہ است
 ننگ دار دعلم از کاری کہ مرزا کرئہ است رنگ دار دعلم از کاری کہ آغا کرئہ است
 میرزا را از بخارا بود دنیا آ با چہ سود؟ خالق اورا چوں بمملک ہند پیدا کردہ است
 یہاں ”پیدا کردہ است“ کے سلسلے میں فدا سلہٹی سے بھی وہی غلطی ہوئی ہے جس
 کا تذکرہ میں نے غالب کے قطعے میں کیا ہے۔ لیکن برصغیر دے اسی طرح بولتے ہیں۔

غالب کے شاگرد باقر علی باقر اردی اور خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی نے
 الگ الگ فدا سلہٹی کا جواب قطعے کی صورت میں لکھا۔ پھر فدا سلہٹی نے ”تیغ تیز تر“
 کے نام سے اس کا منظوم جواب دیا۔ چونکہ اس سے پہلے مرزا غالب نے ”موید برہان“ کے
 جواب میں چونتیس صفحے کا ایک رسالہ ”تیغ تیز“ کے نام سے ۱۸۶۸ء میں ترتیب دے کر
 شائع کیا تھا۔ اس لئے فدا نے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے قطعے کا نام ”تیغ تیز تر“

رکھا۔ بہر کیف۔ مرزا غالب اپنے رسالے "تیغ تیز" کی تمہید میں آقا احمد علی اصفہانی کے علم کا یوں اعتراف کرتے ہیں:-

"عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر فارسیت میں برابر فحس و

نامزد گوئی میں کم تر جتنے الفاظ تذلیل کے ہیں وہ جن جن کمر میرے

واسطے استعمال کئے ہیں" (خود غالب نے احمد علی کے خلاف جو

دشنام طرازی کہے اس کے بارے میں کچھ نہیں فرماتے۔"

غالب کے رسالے "تیغ تیز" کے جواب میں احمد علی اصفہانی نے اپنا رسالہ

"شمیر تیز تر" ۱۸۶۸ء میں کلکتے سے شائع کیا۔ جس کی ضخامت ۱۲۲ صفحے ہے ۲۷۔

اس پر قاطع برہان کی بحث کا خاتمہ ہو ا کیونکہ ان دنوں غالب کافی ضعیف ہو چکے

تھے۔ ادبی مباحث سے زیادہ انہیں جسمانی صحت کی فکر تھی۔ آخر کار ۱۵ فروری

۱۸۶۹ء کو مرزا وفات پا گئے۔

مولانا حاتمی لکھتے ہیں کہ ایران کے مشہور لغت نویس رضا قلی ہدایت نے اپنی "فرہنگ

ناصری" (فرہنگ النجس) آراء ناصری، مطبوعہ ۱۲۸۸ھ میں برہان قاطع کے اغلاط پر روشنی

ڈالی ہے اور جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کئے ہیں ان کی بھی جا بجا "فرہنگ ناصری" سے

تائید ہوتی ہے ۳۳۔ تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد معین مرحوم نے تصحیح و حواشی کے

ساتھ برہان قاطع کا نیا ایڈیشن شائع کر دیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے "جلس

یادگار غالب" نے "درفش کاویانی" کے نام سے قاطع برہان کا تازہ ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں

چھاپ دیا ہے جس کے مدیر و مصحح پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر ہیں۔ تعجب ہوتا

ہے کہ فاضل مرتب نے احمد علی کو اصفہانی کے بجائے شیرازی کیسے مکھ دیا ۳۴۔ کیا اچھا ہوا اگر

آقا احمد علی اصفہانی کی "موید برہان" بھی تصحیح و حواشی کے ساتھ شائع کر دی جائے تاکہ ملک

کا پڑھا مکھا طبقہ اس سے استفادہ کر سکے اور ہر دن ملک بھی ہماری فرہنگ نویسیوں

کی علمی کادشوں اور تحقیقی موٹنگا فیولہ سے اہل علم واقف ہو سکیں اور سلسلہ غالبیات کی ایک اہم کڑی مکمل ہو جائے جس طرح انجمن ترقی اردو کراچی (پاکستان) نے اس ادبی نزاع کی تفصیل ”ہنگامہ دل آشوب“ (حصہ اول و دوم) کے نام سے شائع کر دی ہے۔

نوٹ: میرے قلم کریم فرماؤ، اکثر ضیاء الدین ڈیسا نے اپنے مضمون پر عنوان ”غالب اپنے دو معاصرین کی نظر میں“ (مطبوعہ غالب نامہ، نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۲ء) میں میرے مقلدے پر جزدی اعتراضات کئے ہیں۔ مثلاً مدرسہ عالیہ کی جگہ گورنمنٹ مدرسہ یا مدرسہ کالج لکھنا اور رسالہ ”ترانہ“ اور رسالہ اشتقاق کے موضوعات کی تفصیل بتانا چاہیے تھا۔ اور احمد علی کی تاریخ وفات درست نہیں حال اُن کہ میں نے وہی تاریخ لکھی ہے جو ڈیسا کی صاحب فرماتے ہیں، ہاں بعض جگہ میں جزدی ترمیم کر لی ہے۔ میرا مقالہ غالب اور احمد علی کے ادبی تنازع سے متعلق ہے۔ اس سے غیر متعلقہ تفصیل کی توقع بے جا ہے۔ البتہ مجھے شکایت ہے کہ ڈیسا صاحب نے اس انصاف پسندی کی داد نہ دی کہ غالب اور ان کے طرف داروں کی فحش نگاری کے بعد بھی احمد علی نے ”ہفت آسمان“ میں غالب کا ترجمہ دیا نہ داری سے لکھا۔ غالب کی فرہنگ نویسی کے سلسلے میں مشہور محقق پروفیسر نذیر احمد صاحب کا یہ قول جس کا حوالہ خود ڈیسا صاحب نے دیا ہے (صفحہ ۱۷۱) یہاں پیش کرتا ہوں۔

”برہان قاطع کے نقائص کی نشاندہی جن صلاحیتوں کا تقاضا کرتی تھی۔ غالب میں وہ صلاحیتیں تھیں۔“ اس کی تفصیل پروفیسر صاحب موصوف کی کتاب نقاد قاطع برہان (مع ضمیمہ) میں ملاحظہ فرمائیے۔

حواشی

۱۔ ہفت آسمان ص ۳۰ (بلاخسن کا انگریزی مقدمہ) حیات غالب (ص ۱۱-۲۱)

مشرق بنگال میں اردو، (ص ۴۲-۴۵)

۲۰ یادگار غالب ص ۵۹

۲۱ نوائے ادب، بمبئی، جولائی ۱۹۵۰ء (ص ۲۲) بحوالہ سروش سخن از سید فخر الدین حسین سخن دہلوی۔ مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی (ص ۲۳)

۲۲ وفاراشدی نے اسے مثنوی کے سات اوزان کی شرح لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ (بنگال میں اردو ص ۲۳)

۲۳ خالی نے مؤید البرہان (یادگار غالب ص ۵۹) اور وفاراشدی نے تذکرہ مؤید البرہان لکھا ہے جو درست نہیں (بنگال میں اردو ص ۲۳)

۲۴ مشرق بنگال میں اردو (ص ۲۴)

۲۵ ہفت آسمان (ص ۳) ۲۶ بنگامہ دل آشوب (تفصیل)

ملاحظہ ہو ص ۴۱-۵۲

۲۷ نقش آزاد (ص ۳۳-۳۴) ۲۸ بحوالہ بنگامہ دل آشوب (ص ۲۱-۲۲)

۲۹ درفش کاویانی۔ پیش لفظ (ص ۲۲) ۳۰ بنگامہ دل آشوب (ص ۲۳) لیکن

۳۱ خطوط غالب (ص ۷۸) ۳۲ بلاخسن نے اس کی ضخامت ۱۰۶ صفحہ لکھی ہے۔

۳۳ " " " (ص ۱۹) (مقدمہ ہفت آسمان ص ۳)

۳۴ بنگامہ دل آشوب (ص ۲۴) ۳۵ یادگار غالب (ص ۵۵-۵۶)

۳۶ " " (ص ۱۸) ۳۷ درفش کاویانی (ص ۵-۶)

۳۸ بلاخسن نے (مقدمہ ہفت آسمان ص ۳) اور پروفیسر اقبال نعیم نے (مشرق بنگال میں اردو

ص ۲۳) پر سال طباعت ۱۸۶۵ء لکھا ہے۔

۳۹ خطوط غالب (ص ۲۸)

۴۰ " " (ص ۴۳-۴۴)

۴۱ تحقیق نامہ باغِ دو در (ص ۱۵۹-۱۶۰)

۴۲ بنگامہ دل آشوب (ص ۲۴)

۴۳ خطوط غالب (ص ۶۱)

غالب کے ایک بنگالی شاگرد (خواجہ عبدالغفار اختر)

داد غالب بھی تجھے دیں گے زباں دانی کی
لے کے اختر جو یہ دلی میں غزل جائے گا

اسے غالب کا فیضِ سخن کیجئے یا شاعر کا اکتاپ فن جس نے کالے کوسوں بڑھادیش
میں بیڑ کر شاعر کو یہ شعر کہنے پر مجبور کیا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ عبدالغفار
اختر کو زبان سے کتنی دلچسپی اور اس پر کس قدر دسترس حاصل تھی۔ اختر کے بارے میں اس
سے پہلے عبدالغفور نساج، منشی رحمان علی طیش شنہ، الملک حکیم حبیب الرحمن، مالک رام

۱۔ ”سخن شہرا“ مرتبہ عبدالغفور نساج، مطبوعہ قول کشور پریس (۱۳۹۱ھ)

۲۔ ”تواریخ ڈھاکا“ مرتبہ بیہودی رحمان علی طیش، مطبوعہ اشار آف انڈیا پریس، آر۔ ۱۸۱۰

۳۔ ”نملاز نساج“ حصہ اردو/فارسی) مرتبہ شہناز الملک حکیم حبیب الرحمن مرحوم (ڈھاکا) قلمی

تذکرہ اردو فارسی عربی، الگ الگ تین حصوں میں تینوں زبانوں کے مصنفین کے حالات اور نمود تحریر پر مشتمل ہے

۴۔ ”تلاذہ غالب“ مرتبہ مالک رام، مرکز تصنیف تالیف نکلور (دسمبر ۱۹۵۷ء ص ۲۹۹)

ڈاکٹر عنایت شادانی، پروفیسر سید اقبال عظیم، اور وفاراشدی نے جتنا اور جو کچھ لکھا ہے، اس مقالے میں اس پر مزید اضافہ اور غیر مطبوعہ کلام کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

خواجہ عبدالغفار اختر خاندان نواب کے نوابوں کے نمایاں فرد رئیس اعظم شہر ڈھاکہ خواجہ عبدالغفور کے صاحبزادے نواب خواجہ عبدالغنی کے بھائی نواب خواجہ احسن اللہ شاہین

۱۔ ”مشرقی پاکستان کے اردو ادیب“ میں ڈاکٹر شادانی کی ریڈیائی تقریر خواجہ عبدالغفار اختر سے متعلق ص ۲۵-۳۱ اور مطبوعات پاکستان کراچی (۱۹۵۵ء)

۲۔ ”مشرقی پاکستان میں اردو“ مرتبہ پروفیسر اقبال عظیم، مشرقی پاکستان کو آپریٹو پبلی کیشنز ڈھاکہ۔ (۱۹۵۴ء)

۳۔ ”ہنگال میں اردو“ مرتبہ وفاراشدی، مکتبہ اشاعت اردو، حیدر آباد سندھ پاکستان (۱۹۵۵ء)

۴۔ خواجہ عبدالغفور خواجہ عبدالغفار کے والد محترم۔

۵۔ خواجہ عبدالغنی، خواجہ عظیم اللہ کے صاحبزادے، خواجہ عبدالغنی آباؤی جائداد کو اور ترقی دی اور سرکاری قیدی سے اپنے اور اپنے ورثہ کے لئے ہمیشہ کے واسطے نواب بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ سر عبدالغنی کی داد و دہش کا شہرہ ہند سے کرعرباً روم، شام اور یورپ تک آج بھی ہے کہ انہوں نے نہ صرف ڈھاکہ میں بے شمار غراہ اور مساکین کی پرورش کا سامان بہم پہنچایا بلکہ عرب میں نہر زمیہ کی مرمت کے لئے خاصی رقم بھیجی اور روس و ترکی کی جنگ میں سپاہ ترکی کے قیدیوں اور بے روزگاروں کے لئے زر کثیر ارسال کیا ۱۸۷۴ء میں برصغیر آف ویلز کی تشریف آوری ہوا میں اسے ”جن اللہ“ کا خطاب ملا اور گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر ہوئے پھر نائٹ کا خطاب پایا۔ نواب احسن اللہ شاہین اسی لائق نواب کے لائق بیٹے تھے۔ (مشرقی پاکستان میں اردو، ص ۶۲)

۶۔ خواجہ احسن اللہ شاہین خواجہ عبدالغنی کے صاحبزادے، شاہین کی ولادت ۱۲۶۷ھ - ۱۸۴۶ء اور وفات ۱۹۰۱ء ”مشرقی پاکستان کے اردو ادیب“ ص ۶۲-۵۶۔

کے ماموں اور استاد سخن نساخ، نواب سید محمود آزادؒ، خواجہ حیدر جان شائق اور آقا احمد علی
 اصفہان کے معاصر تھے۔ مرزا غالب کی ضعیفی کے وقت ان کا عالم شباب تھا فن شاعری کی تعلیم
 لے نساخ، عبدالغفور ولادت ۱۲۴۹ھ وطن فرید پور بنگال وفات ۱۳۰۶ھ خان بہادر کا خطاب پایا۔
 بنگال کے مختلف مقامات میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے متعین رہے۔ خان بہادر
 نواب عبد اللطیف فرید پوری (۱۸۲۸ء - ۱۸۹۳ء) کے چھوٹے بھائی اور تقریباً ایک درجن سے
 زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ نساخ کے دیوان اولیٰ و فزیرے مثال کی رسید کے طور پر غالب نے
 اپنے ایک خط میں ان کی تعریف کی ہے۔

۳۔ نواب سید محمود آزادؒ ولادت ڈھاکا ۱۸۲۳ء وفات ۱۹۰۷ء اردو فارسی کے کہنہ مشق صاحب
 دیوان شاعر مطبوعہ (۱۸۸۹ء) ابتدائی تعلیم و تربیت آقا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی۔
 حافظ اکرام احمد ضمیمہ سے شاعری میں تلمذ تھا۔ نواب سید محمد آزادؒ ولادت ڈھاکا (۱۸۴۷ء)
 اودھ پنج لکھنؤ کے مشہور نامہ نگار ان کے چھوٹے بھائی تھے۔

۴۔ خواجہ حیدر جان شائق (وفات ۱۸۷۸ء) خواجہ خلیل اللہ کے صاحبزادے، اردو فارسی
 کے صاحب دیوان شاعر اور غالب کے شاگرد اصل نام خواجہ فیض الدین اور عرفیت
 حیدر جان ہے ان کے نام غالب کا ایک فارسی نام "مستر غالب" (مترجم قاضی عبدالودود) میں
 شامل ہے۔ نیز "مشرق پاکستان کے اردو ادیب" ص ۷۵ ملاحظہ ہو۔

۵۔ آقا احمد علی اصفہانی ساریکنی، مظلہ علی جس سے (۱۲۵۵ھ) نکلتے ہیں وفات (۱۲۹۰ھ) والد
 آقا شجاعت علی داد آقا عبدالعلی نواب سید محمود آزادؒ نواب سید محمد آزادؒ دونوں بھائیوں
 کے استاد خواجہ اسد اللہ کوکب کے شاگرد، حمد تخلص تھا فارسی اردو میں سرکہتے تھے فارسی اور
 علم و رضا کے ماہر غالب کی "طالع برہان" کے جواب میں موبہ برہان (تقریباً پونے پانچ مہینوں
 پر مشتمل) ایک ضخیم فرسنگ ترتیب دی، مشہور "مشرق بلافسن" کے استاد تفصیل کے لئے ملاحظہ
 ہو راقم کا مقالہ "غالب کے ایک حریف" مطبوعہ "غالب نامہ" دہلی جولائی ۱۹۸۱ء تقریباً ۳۵ سال
 کی عمر میں انتقال کیا۔

و تربیت حافظ سید اکرام احمد ضعیف رامپوری سے حاصل کی جنہیں انیسویں صدی کے بنگال کا مصحفی کہنا چاہیئے۔ ابتدا میں کلام پر اصلاح اپنے خاندانی بزرگ خواجہ عبدالرحیم صاحب سے لی۔ جن کی علمی و ادبی صحبتوں سے آقا احمد علی اصفہانی جیسا محقق و علم عروض کا ماہر بھی مستفید ہوا تھا۔

پہلا دیوان سرقہ ہو جانے کے بعد بظاہر شعر و سخن سے دست بردار ہو چکے تھے۔ لیکن مرزا جب علی اثیر کی ڈھاکے میں تشریف آوری، ان کے اعزاز میں شعر و سخن کی محفلیں اور اختر سے ان کے دوستانہ تعلقات و روابط کے باعث شعر گوئی کا دوبارہ سلسلہ شروع ہوا۔ جسے اختر کی شاعری کا دور ثانی کہنا بے جا نہ ہو گا۔ یہ سلسلہ آگے چل کر اختر کی طبع رسا، ذوق سخن اور شور و فن کو غالب دہلوی سے اکتساب فن پر آمادہ کرتا ہے۔ ان کے اجداد میں خواجہ حفیظ اللہ کثیر سے ترک وطن کر کے ڈھاکا آئے تھے، لیکن اختر کی پیدائش پر درخش و پرداخت اور تعلیم و تربیت ڈھاکے میں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے لئے غالب کی شاگردی و رہنمائی کو دنیا کے شاعری میں خوش مذاقی اور زبان دانی کا ثبوت سمجھتے تھے، اور ڈھاکے میں اپنی شاعری کا ہنر دکھانا

۱۔ حافظ اکرام احمد ضعیف رامپوری وفات (۱۲۸۶ھ) والد کا نام قطب الدین شاہ رؤف احمد رافت سرہندی (شاگرد جرات) کے شاگرد اور داماد بن عروض کے مجتہد نسخ عبد الغفار اختر خواجہ احسن اللہ شاہین اور خواجہ عتیق اللہ شیدائے استاد غزل میں ضعیف، مرثیے، رباعی اور ہزل میں مہمان تخلص کرتے تھے۔ ابتدا میں حشمت تخلص تھا۔

۲۔ خواجہ عبدالرحیم صاحب، خواجہ سلیم اللہ کے صاحبزائے، خواجہ علیم اللہ کے داماد اور برادر زائے، فارسی ان کی نظم و نثر کا سرمایہ زیادہ ہے اور اردو میں کم، وفات (۱۲۸۸ھ - ۱۲۸۷ھ) خاندان خواجگان ڈھاکا کی تاریخ، کثیر زبان ڈھاکا کے نام سے فارسی میں لکھی ہے۔

۳۔ مرزا جب علی اثیر، کسی تذکرے میں تفصیل نہ مل سکی۔

۴۔ خواجہ حفیظ اللہ خاندان خواجگان ڈھاکا کے پہلے شخص جو کثیر سے ترک وطن کر کے ڈھاکے میں آئے۔

۵۔ نواب نعت جنگ بہادر نائب نظامت کاہنڈ تھا تجارت سے کافی دولت حاصل کی اور قلعہ مین سنگ میں نیزہ خریدی۔

تھمیل حاصل تصور کرتے تھے، دو جگہ اپنے منقطعوں میں اس کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں۔

لے کے اختر غزل جلو دہلی : پاں ہنر اپنا کچھ دکھا نہ سکے

ذرا جہل کے دہلی میں پڑھے غزل : ہے ڈھاکے میں تھمیل حاصل عبت

خواجہ عبدالغفار اردو میں اختر، فارسی میں وفا اور ریختی میں نزاکت تخلص کرتے

تھے۔ اس ثبوت کے لئے کہ اختر اپنا فارسی کلام بھی غالب کی خدمت میں بغرض اصلاح

بھیجا کرتے تھے۔ اسی کتاب میں "بنگال میں غالب شناسی" پر مقالہ ملاحظہ کیجئے

صحیح نہیں کہ "سید محمود آزاد اور خواجہ حیدر جان شائق کے علاوہ خواجہ عبدالغفار اختر ڈھاکے کے

تیسرے شاعر تھے جنہیں مرزا غالب سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ شرفِ المصنیٰ صاحب کی روایت کی

بنیاد پر استاد محترم ڈاکٹر غنڈ گیش شادانی کو بھی سہو ہوا ہے کہ جب غالب اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے

کلکتے آئے ہوئے تھے تو وہاں ان کی ملاقات سید محمود آزاد سے ہوئی۔ غالب کلکتے فروری ۱۸۲۸ء میں

۱۔ تواریخ ڈھاکا بجز "مشرق پاکستان میں اردو" (ص ۵۱) نیز "بنگال میں اردو" (ص ۶۲)

۲۔ (مشرق پاکستان میں اردو" (ص ۵۱)

۳۔ حیدر دہلوی کا یہ خیال درست نہیں کہ خواجہ عبدالغفار ریختی میں وفا تخلص کرتے تھے

۴۔ "مشرق پاکستان میں اردو ادیب"

۵۔ شرف المصنیٰ ولادت ڈھاکا (۱۲۹۵ھ) والدہ ایرانی الاصل تھیں نواب سید محمود آزاد کے بھانجے

اور ڈھاکے کے آنریری مجسٹریٹ اردو فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر، گلستانِ شرف کے نام سے پہلا

مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے (۱۹۳۷ء) دوسرا مجموعہ کلام "دستانِ شرف" غیر مطبوعہ ہے۔

۶۔ "مشرق پاکستان کے اردو ادیب" میں سید محمود آزاد سے متعلق ڈاکٹر شادانی کی ریڈیائی تقریر (۲۱)

۷۔ "ذکر غالب" مرتبہ مالک رام مطبوعہ مکتبہ جامعہ لیمٹڈ نئی دہلی (فروری ۱۹۷۶ء) ص ۶۳

آئے اور سید محمود آزاد کی پیدائش ڈھاکے میں ۱۸۴۲ء میں ہوئی۔ اس لئے دونوں کی ملاقات کا امکان نہیں۔ آزاد غالب کے کلام سے متاثر ضرور نظر آتے ہیں جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ اور یہ بحث کا ایک الگ موضوع ہے، لیکن ان کے شاگرد نہیں۔ اس لئے خواجہ عبدالغفار اختر ڈھاکے میں غالب کے تیسرے نہیں بلکہ دوسرے شاگرد ہوئے۔

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن مرحوم نے بنگال کے اردو فارسی اور عربی مصنفین کا تذکرہ مرتب کرنے کی غرض سے ان کی تمام تصانیف کو تقریباً چالیس سال تک نہایت محنت و مشقت اور کراٹھ و جستجو سے فراہم کیا اور ثلاثہ غنائ کے نام سے ان مصنفین کے حالات اور تصنیفات میں ضخیم جلدوں میں ترتیب دیئے جو اب نامکمل صورت میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات کی زینت ہے حکیم صاحب کا بیان ہے کہ "سخن شعراء" میں شیخ بنگالی عاصی باشندہ ڈھاکہ کے تذکرے نے انہیں چونکا دیا کہ یہ کون صاحب ہیں جنہیں وہ نہیں جانتے، اسی طرح رسالہ "دوربین" (کلکتہ) میں شیخ بنگالی کا کلام دوبارہ جب ان کی نظر سے گزرا تو انہیں مزید تلاش و تنقیش ہوئی لیکن اس عقدے کی گرہ کشائی دریافت کے باوجود ان کے بزرگوں سے بھی نہ ہو سکی۔ کیونکہ یہ ایک راز سرست تھا۔ اختر کی وفات کے بعد حکیم صاحب موصوف کی گزارش پر جب خواجہ عبدالغفار اختر کے صاحبزادے خواجہ عطاء اللہ نے انہیں اختیار کا غیر مطبوعہ دیوان عطا کیا تو مطالعے کے بعد یہ راز فاش ہوا کہ وہ شیخ بنگالی عاصی ہی اختر تھے۔ جن کا "سخن شعراء" اور "دوربین" میں شائع شدہ کلام بھی اس دیوان کی زینت تھا۔ شاید اردو زبان ڈھاکے میں اس وقت اتنی مقبول نہ ہو اس لئے فرضی نام سے کلام کی اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ قارئین کی پسند و ناپسند کا اندازہ لگایا جاسکے۔ بہر صورت "دوربین" کلکتہ میں جو دو غزلیں شائع ہوئی تھیں ان سے دور و شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ "سخن شعراء" مرتبہ نسیخ (نول کشور پریس ۱۳۹۱ء) ۲۔ رسالہ "دوربین" کلکتہ ۷۳ رجب ۱۳۷۷ھ

عہ خواجہ عطاء اللہ، خواجہ عبدالغفار کے صاحبزادے، مزید تفصیل معلوم نہ ہو سکی

ہم زیرِ زمیں جائیں گے اک فوجِ چشم لے رنج و قلق و درد و غم و رنج و الم لے
 دشتِ کدہ دہر اقامت کی نہیں جا اس منزلِ مہموم میں پھر کیا کوئی دم لے
 گراہ کروں سیدۂ افلاک بھی جل جائے گرمی سے مے نالوں کی خورشیدِ بگمل جائے
 ہاں داوڑِ باں دانی کی دیں حضرتِ غالب عاصی جو کوئی دہلی میں لے کر یہ غزل جائے
 بہر صورت یہ کلام خواجہ عبدالغفار اختر کی شاعری کے دورِ ثانی سے تعلق رکھتا ہے
 جب وہ مرزا رجب علی اشیر کی صحبت کے فیض سے دوبارہ شعر و سخن کی دنیا میں واپس آ گئے
 چنانچہ اس کا اظہار یوں کیا ہے:

اے وقافِ من لکھتے یا ہم ازیم فیضِ اشیر ڈھاکا کا امر دوزمن رنگِ صفا ہاں کردہ ام
 یہ دوسرا دیوانِ اختر نے اپنے شاگرد اور ہمیشہ زادے نواب خواجہ احسن اللہ شاہین
 کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

بہ پاسِ خاطرِ شاہین کہ ہے وہ کہیں ہمدرد عزیز از جہانِ اختر
 مرتب نسخہ دل کش کیا ہے نہیں مطلبِ ظہورِ بستانِ اختر
 اخترِ ابتدائے شاعری میں ناسخِ کھنوی کے رنگ میں شعر کہتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے
 بیرونی مہر کو قابلِ اختیار جانا جس کی طرف ان کی توجہ خواجہ عبدالرحیم صبا نے منعطف کرائی
 تھی۔ اس کا اندازہ اختر کے حسبِ ذیل دو مقطعوں سے کیا جاسکتا ہے۔

آتش و ناسخ کو اپنے رو برو کیا سمجھیں ہم
 میں مقلدِ میر کے اختر ہمارا نام ہے

لاکڑ آتش و ناسخ سے شاہین
 ذرا اس فن میں اختر کا ہنر دیکھ

یہاں شاہین سے مراد ان کے شاگرد درخشدہی نواب خواجہ احسن اللہ ہیں جن کی

۱۲۰۲۸

خاطر اٹھولنے اپنے کلام کا "نسخہ دل کش" مرتب کیا تھا۔

اب ناسخ نگہندی کے رنگ میں چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جو یقیناً اختر کے ابتدائی دور شاعری کے ہوں گے جب وہ اپنے معاصرین خصوصاً بنگال میں ناسخ کی طرح ناسخ سے متاثر تھے۔ مثلاً:

تیری زلفوں نے کیل ہے دلِ وحشی کو اسیر
صیدِ رم خوردہ کبھی، صیادِ نہِ دام آیا

خاطرِ خوباں بصیدِ اہلِ دل مسائل نہیں
یا ہمارے دور میں کوئی بھی صاحبِ دل نہیں

جو ہو سو ہو منگہ یار سے، دگر نہ کہاں
ہو فوں فشاں بہ اثرِ ہائی نیشترِ رگِ سنگ

ہے موجِ عکسِ رنگِ گل بہارِ کلفتِ خاطر
اسیرِ انِ نفسِ کب شاد ہوتے ہیں بہاراں سے

برنگِ بوئے گلِ آتشِ نہاں ہے سینہٴ دل میں
مددِ دستِ جنوں اب تنگ آیا ہوں گلتاں سے

نفا، الملک حکیم حبیب الرحمن صاحب کے مطالعے میں اختر کا جو قلمی دیوان رہ چکا ہے، اور جسے وہ "کلیاتِ اختر" کہتے ہیں انہیں کے بقول اس میں مختلف اصنافِ سخن میں

۱۔ کلیاتِ اختر مطبوعہ "المشرق" دھاکا، مارچ (۱۹۰۷ء)

اختر کا کلام موجود ہے۔ مثلاً قصیدہ 'غزل'، مثنوی، رباعی، قطعہ، 'خمس'، 'سدس'، 'داسوخت' اور ترکیب بند: اس کی تفصیل یوں ہے کہ اس مجموعہ کلام میں صرف دو قصیدے ہیں، پہلے قصیدے میں ایک سو ایک اشعار ہیں جس کا مطلع یہ ہے۔

بوقتِ شام کہ خورشید ہو گیا بے نور
جہاں میں تیرگیِ شب نے ڈالارنگِ ظہور

دوسرے قصیدے میں صرف تینتالیس شعر ہیں البتہ مثال نہیں پیش کی گئی ہے۔ ایک قصہ حافظ شیرازی کی غزل پر جس کا مصرع یہ ہے۔

دل میرود ز دستم صاحبِ دلاں خدارا

ایک مختصر ساداسوخت ہے جس کا ایک بند یوں ہے:-

نادکِ سحر جگر در زبے اللہ اللہ داغِ وقت شرر افروز ہے اللہ اللہ
سینہ بھی ہائے غم اندوز ہے اللہ اللہ خاطر آشفہ شب در زبے اللہ اللہ

ہمت اے دل کہستم اور اٹھانا ہے مجھے

طاقت اے نالہ کہ لب تک ابھی آئے مجھے

ایک رباعی کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

گر خضر نے عمر جاودانی پائی یا آبِ حیات کی نشانی پائی
کیا ناز کرے اس پہ کہ جب آخر کار کہ مرنے کے لئے زندگانی پائی

چار خطوط بھی ہیں (غالباً منظوم ہے) جن میں اس زمانے کی روش کے مطابق نازکی

الفاظ بھی خوش اسلوبی سے استعمال کئے گئے ہیں آخر میں "دفتر عشق" کے نام سے ایک

مثنوی ہے غالباً یہ اختر کے دور کی آخری یادگار ہے کیونکہ اس میں روانی زبان کے ساتھ ساتھ

شیرینی بیان بھی ہے اور نہایت دل دوز اور دل انگیز انداز میں لکھی گئی ہے۔

اصل "پہر" (تصحیح قیاسی)

غزلیں تقریباً ہر ردیف میں ہیں لیکن چھوڑ بکروں میں خصوصیت کے ساتھ بڑی رواں اور پاکیزہ غزلیں کہی ہیں، جن میں زبان و بیان کا لطف بھی پایا جاتا ہے۔ ان غزلوں پر میر کا پرتو کیسے یا غالب سے اکتساب فن کا فیض بہر صورت میں بہت دلچسپ اور سادہ و شمسۃ تین ردیفوں کی غزلیں پیش کی جاتی ہیں۔

دل اپنا ہوا نہ یار اپنا	دیکھیں کیا ہو مسائل کار اپنا
کعبہ دہشت کدے کو جا دیکھا	ہوئے کس جا بربار کار اپنا
آنکھیں جاتی رہیں گی آخر کار	یہ دکھاتا ہے انتظار اپنا
زلف چہرے پر مت پریشان کر	طول کھینچے کا انتظار اپنا
گئے صبر و قسار تاب و توان	نہ رہا کوئی غم گسار اپنا

کوئے جاناں میں ہم تو جان سکے	حال اپنا اسے سنا نہ سکے
صحبۂ بد، حجاب کار ہوئیں	وہ طبیعت ادھر کو لا نہ سکے
دل کا پوچھا نشان تو شرم لے	جانتے تھے مسکرت نہ سکے
شیخ سیہ اس کی ہم گلے نہ ملے	اپنا جوہر اسے دکھا نہ سکے
زورِ ناطقستی نے دکھلایا	سر کو بالیں سے ہم اٹھا نہ سکے

جنوں شورشِ فرائی ہو چکی بس	بہارِ آشنائی ہو چکی بس
نہ لایا تاب جو بربار تو نے	دلا صبر آزمائی ہو چکی بس
چلے میخانے کو کعبے سے ناصح	اب ان کی پار سائی ہو چکی بس
جو ہے یہ خوش نوائی تیری اختر	تو پھر یاں سے رہائی ہو چکی بس

اگرچہ گذشتہ صفحات میں بعض اشعار میں اختر نے اپنی زبان دانی اور شاعرانہ ہنر پر

فردنا زکیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کہیں کہیں ان کے کلام میں زبان و بیان کی ناموزنی
 و لغزش کے ساتھ ساتھ ڈھاکے کا مخصوص لب و لہجہ اور محاورہ بھی راہ پا گیا ہے۔ اس کے
 دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو بنگلے کا ماحول جس سے شاعر کی مفرز تھا اور دوسرے
 یہ کہ ان کی تعلیم بچہ اور مکمل طور پر نہ ہوئی تھی۔ اس لئے روزمرہ محاورہ اور عروض و
 قواعد کے استعمال میں چونکہ ایک فطری امر تھا مثلاً ذیل کے تین شعروں میں خط کشیدہ الفاظ۔

دلایا تاب جو ریا ر تو نے

دلا صبر آزمائی ہو چکی بس

ہم کہاں رقی میں چھل بلیاں

تیری رفتار کچھ قیامت ہے

شکایت کیا کریں اختر ستم ہائے صنم کی ہم

بدی اس نے جو کچھ کی ہم نصیبوں کا بد سمجھے

مولوی رحمان علی طیش مصنف تواریخ ڈھاکا جو بجائے خود ڈھاکے کی چلتی

پھر قی انسا کیلو پیڈیا تھے۔ عبدالغفار اختر کے بارے میں لکھتے ہیں:

آپ نے اپنا ایک کلیات بفرمائش نواب سر حسن اللہ بہادر مرحوم

مرتب کیا۔۔۔ آپ کا فارسی کلام نہایت فصیح و بلیغ و شیر کی طرز

پر ہے اور اردو میں آپ نے میر تقی مرحوم کا طریق اختیار کیا ہے آپ کو یہی

میں نعت گوئی کی طرف رغبت ہوئی اور بہت نعت کلام مقبول ہے۔

طیش کا یہ بیان ہماری خاص توجہ چاہتا ہے کہ اختر کا فارسی اور نعت کلام کیوں دنیا

لے "تواریخ ڈھاکا" مترجم رحمان علی طیش، مجلہ "مشرق پاکستان" میں اردو، ص ۱۳

نہیں ہوتا۔ یہ کہنا ہے جادہوگا کہ جب ان کا کلیات یا دیوان ہی اب مفقود ہے تو کلام کا پایا جانا ممکن نہیں، البتہ پروفیسر اقبال عظیم کا یہ بیان کہ:

”خاندان خواجگان کی کئی بیاضیں میرے پاس ہیں جن میں سے ایک بیاض خواجہ احسن اللہ شاہین خواجہ عبدالغفار اختر خواجہ عبدالرحیم صبا اور خواجہ عتیق اللہ شیدائے گیتوں کا فون غزلوں، رباعیوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔“ ۱۷

اس امر کا شاہد ہے کہ خواجگان ڈھاکہ کی یہ بیاض اقبال عظیم صاحب کے ساتھ کراچی (پاکستان) چلی گئی۔ ایسی صورت میں یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں اختر کے فارسی کلام کے علاوہ نعتیہ کلام بھی ہے کہ نہیں، البتہ موصوفی نے اختر کے درج ذیل دو نعتیہ اشعار غالباً اسی بیاض سے نقل کئے ہیں جو کہیں اور میری نظر سے نہیں گزرے۔

اے روحِ رواں! داروے دل چارہ گر جاں
اے خیمہ رسل، قبلہ دیں، کعبہ ایمان

اے نورِ ز تو عکسِ فگن آئینہ توحید

در وصفِ تواندیشہ فجل، ناطقہ حیراں

نومبر ۱۹۵۲ء میں جب ڈھاکہ کا یونیورسٹی کے ان قلمی نسخوں کا جائزہ لے رہا تھا جی کی کئی سال سے فہرست مرتب نہ ہو سکی تھی۔ اس میں اتفاق سے ”منظوم اختر کے نام سے ایک ایسی دستاویز ہاتھ آگئی جس سے اردو شاعری کی دنیا واقف نہ تھی۔ یہ نقل اسکیپ سائز کی تقطیع پر کسی خوش نویس نے نستعلیق خط میں لکھی ہے اور ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن دست برد ز مادی وجہ سے کرم خوردہ ہو چکی ہے۔ اس میں حسب ذیل اصنافِ سخنِ نعتیں لکھی گئی ہیں:

۱۔ مشرقی پاکستان میں اردو“ (ص ۵۱-۵۲) سفر پاکستان کے دوران چند سال قبل جب شام بارک پور کے پروفیسر اقبال عظیم سے ان باتوں کے بارے میں استفسار کیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ پاکستان چلتے وقت بیاضیں ان کے ماکوں کو دے گئے تھے۔ ۲۔ ماسبق (ص ۵۲)

جن کی تفصیل یہ ہے: (۱) پانچ نعتیہ غزلیں (۲) دو نعتیہ سلام (۳) ایک نعتیہ ستراد (۴) ایک نعتیہ قطعہ خواجہ عبدالغفار اختر کی نعت گوئی کا جائزہ اسی پس منظر میں لینا ہوگا جس دور سے ان کا تعلق تھا، یعنی انیسویں صدی کی تقریباً تیسری چوتھائی، اختر کی نعتوں میں بیان کی صفائی اور سادگی ہے لیکن دل کشی نہیں، اسی طرح زبان عام فہم ہے لیکن نقائص سے پاک نہیں۔ اس میں بعض جگہ فعل لازم و فعل معدی اور تذکیر و انیث کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے بعض جگہ مصرعے یا توراوا نہیں یا ناموزوں ہو گئے، دو ایک جگہ قافیہ کا عیب بھی ہے۔ قدیم رسم کتابت کی وجہ سے یا بے معروف و یا بے مجہول ہائے محذوہ و غیر خلیط میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا ہے اور دو لفظوں کو ایک ساتھ ملا کر لکھا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کی تفصیل "منظوم اختر" کی تدوین و ترتیب کے حاشیے سے آئندہ صفحات میں واضح ہو جائے گی۔ لیکن یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ کسی اور شخص (حکیم حبیب الرحمن مرحوم) یا فخر شاعر نے جا ہی کلام پر نظر ثانی کی ہے جیسا کہ اس قلمی نسخے کی تحریر سے ظاہر ہے۔ اختر نے نعتیں جمی ہوئی اور بڑی دونوں بحر میں کہی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں مختلف بحروں میں شعر کہنے پر قدرت تھی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اختر کے ہنگامی معاصرین میں خان بہادر صدر الصدور مولوی وجہ اللہ سامی چاٹا گامی کے نعتیہ اشعار کا ایک مجموعہ "الغور العظیم فی مولد النبی الکریم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مولوی حمان علی طیش نے "گلزار نعت" کے نام سے اپنی نعتیہ غزلوں اور قصیدوں کا مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ آخری عمر میں ترک دنیا کے باعث نعت گوئی کو وسیلہ مغفرت جان کر اختر نے اتنی اور ابھی خاصی تعداد میں نعتیں کہیں کہ مجموعہ مرتب ہو گیا۔ اب "منظوم اختر" مکمل صورت میں درج کیا جاتا ہے۔ البتہ کرم خوردہ مقامات کی خادہ پوری تاجدار مکان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں اس امر کا اظہار بھی باعث مسرت ہوگا کہ حسن اتفاقاً اختر کی تصویر بھی دست یاب ہو گئی

لے ڈاکٹر محمد صدق الحق نے اپنی کتاب "فلسفہ تصانیف" میں اسے نثر کی کتاب بتایا ہے جو درست نہیں۔

منظومہ اختر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسم پاک خدائے عزوجل سب سے اول کہ سب سے پہلے اول
منہجہ جملگی شیون و صفات کنا بخدا ہے وہی خدا کی ذات
وحدہ لاشریک پس ہے اس کے مانند ہی نہیں کوئی شے
ابتداء انتہا سے وہ باہر ہے اپنی قدرت کا آپ وہ مہر
کوئی اس کا نہیں ہوا انباز نہ کوئی ہے شریک و محرم راز
وحدت اس کی بیاں میں آئے مکے دم اس جا پہ بار پائے مکے
مسئلہ یہ وجوب دما کاں کا سوچنا و سوسہ ہے شیطان کا
علم کا زور وہ دکھاتے ہیں جو حدوث قدم سلاتے ہیں
لاکھ (اثبات) کو کوئی کھوٹے عکس شے عین سے کہاں ہوٹے
یاں تو کچھ عکس سے بھی کام نہیں جنبش لب کا یہ مقام نہیں
دھیان میں لاؤ اس لطافت کو سوچ کچھ اپنی بھی کثافت کو
جمع ضدین بولو کیوں کر ہو خلق خالق کا کیوں کہ ہمسر ہو
صوفیوں کے کلام کو نہ کہو سمجھو قاصر سمجھ کو دور رہو
اس کی تاویل ہے بہت مشکل علم ظاہر سے وہ نہ ہو حاصل
اور از روشی علم ظاہر بھی روکشی ان کی ہو نہیں سکتی
صاف دل ان کا مثل آئینہ ساری دنیا سے یاں حذو کینہ
نہ تافہ درست نہیں، شے صحیح: کی شے صحیح: کے شے صحیح: روئے

عکس انگن و ہاں حقیقتِ حال
 شرع طرزِ معاشِ دنیا ہے
 تم کو یاں حکمِ شرع خوابِ خیال
 ہے حصولِ معاد میں یہ دلیل
 کردہ واصلِ براہِ عقبتی ہے
 داخلِ شرع میں فروع و اصول
 حکم (حق) میں نہیں ہے قال و قیل
 طے ہی اس راہ کی طریقت ہے
 روش اس کی طریقِ قرب و وصول
 راہ میں منزلیں ہیں درودِ راز
 پھر کھلے آگے جو حقیقت ہے
 منزلوں کا جدا ہے رنگ
 جن میں ہیں ساز و برگ (ناز و نیاز)
 جو کہ پہنچے ہیں بس و جانتے ہیں
 چلنے والوں کا بھی نرالا ڈھنگ
 وجد میں ہے خودی جب آتی ہے
 کیا وہ سمجھیں جو خاک چھانتے ہیں
 روح دل میں نہیں سماتی ہے
 بولتے ہیں زبانِ حال سے وہ
 کام رکھتے نہیں ہیں قال سے وہ
 دین و دنیا کو دیتا ہے جو بھلا
 مے وحدت کا نشہ ہے وہ رسا
 دین و دنیا جلتے ہیں دو جہاں کی بات
 یادِ حق میں وہ محو ہیں دن رات
 کب وہ کھلتا ہے رازِ ہم سب پر
 تب ہم دوست لاتے ہیں لب پر
 ہم زبانیں تو کیا کریں اظہار
 خارج (اس) سے ہیں اور کئی اسرار
 اس میں ہوش و خرد کو دخل ہے کب
 ہو العجب کار ہائے عشق میں بہب
 وہ ہوا سارے کام سے معذور
 عشق نے کر دیا جسے مجبور
 قیدِ احکام سے ہیں وہ آزاد
 جن کو بھولی ہے دو جہاں کی بات
 پھر سند بھی ہے ان سے بس باطل
 ہم کو وہ حال جب نہیں حاصل
 یاں ادب و ان شہود الفت شرط
 چاہیے قال حسبِ حال کرد
 گم نہ سرِ رشتہٗ مقال کرد وہ
 کر دل میں یقینِ زباں سے کہو
 دیکھو سب اس کے علم و قدرت کو

مبدءِ آفرینش عالم حق نے اس کو کیا بلطف و کرم
 آتش و آب و خاک، باد و فلک عرش و کرسی و جن و انس و ملک
 قلم و لوح اور جہا و نبات علوی و سفلی کے یہ مخلوقات
 بخم و خور، ماہ، سب اسی سے بنے قصہ کوتاہ، سب اس سے بنے
 نور اقدس نے جب دکھایا ظہور وہیں سجدے کو وہ ہوا مامور
 جھکی گردن کہ سر بلند ہے عاجزی کی کہ ارجمنڈی ہے
 ناز دیکھا، نیاز سے بولا دفترِ شکرِ رحمت گنولا
 حمدِ خالق بیان کرنے لگا صفتِ عز و شان کرنے لگا
 نظرِ لطف کا ہوا منظور سرِ باطن کھلا ہوا مسرور
 بحرِ اکرام جو شش میں آیا ابرِ رحمت فروزش میں آیا
 بارک اللہ، کیا جواب ملا پہلے لولاک کا خطاب ملا
 واہ قدرت کی کار پردازی آفرینش میں کی خوش آفرینی
 سبقتِ رحمتِ خدا دیکھو کیسی بندوں پر ہے عطادیکھو
 کہ کیا اس کو مقتدا سب کا پیش رو سب کا، پیشوا سب کا
 جس (سے) ہے روبرو کو زند وجود کیا جس کو ملا لگوں نے سجود
 جبہٴ بوالبشر میں تھا ہی نور تب ملک سجدے کو ہوئے مامور
 تنہی اسی نور کی وہ شان نمود جس سے ابلیس ہو گیا مطرود
 ہی منشور کن کلمے عنوان اس سے روشن ہے خانہٴ ایمان
 علمِ عینِ یقین کا آخر کار اسی منزل پر ہے مقامِ مدار
 ظلِ اصلی کا خاص ہے یہ مقام اسی جاعقل و ہوش (گم) ہیں تمام
 چپ ہوا خیر کہ ہے۔ جائے ادب سرِ باطن کھلا ہے تجھ پر کب ؟

بس زیادہ رنج و غم میں آؤ لب کر و بند، ہوش میں آؤ
 گنت گنت کفر کو جو نبیؐ نے کہا راز اس کو خواص ہی پر کھلا
 خاص باتوں میں دخل عام نہیں ہوا داسب سے، یہ وہ کام نہیں
 کچھ سمجھ کر قلم کو ہاتھ میں لے جہل پر اپنے بھی نظر کر لے
 حد سے زیادہ زبیں نکال قدم بھر اس دادی سے عنانِ قلم
 خود فروشی خود نمائی ہے کہ ترے دل میں کیا سمائی ہے
 نہیں مقصود جب کہ شہرت نام تجھ سے ناداں کو بس ہے اتنا کام
 صدق دل سے خدا کو کرے سجود ہو سکے جتنا پر ڈھ نبیؐ پر درود
 اس سے افروں ہوں ہو کر دل میں چھپر تو ایسا ذکر محفل میں
 جس میں ہوئے بیانِ نعتِ رسولؐ گفتگو حق پر خلق کو مقبول
 اک روایت نئی سنا سب کو شرفِ احمدی دکھا سب کو
 حاضرین محفلِ قدس وہ روایت ہو جس سے دل کو انس
 جس میں کچھ سازش و غلو ہی نہیں جس میں کچھ جائے گفتگو ہی نہیں
 جو کہ ثابت ہے نصِ قرآن سے یمن رکھتا ہے جو کہ ایمان سے
 نورِ رخشاں سرمدی دیکھو شرفِ شانِ احمدی دیکھو
 ہیں رسولِ خدا سبھی حق ہیں فرقِ عمدے کا تو کسی میں نہیں
 پر فضیلت میں فرقِ بین ہے صاف اس میں دلیل روشن ہے
 بعض کو ہے جو بعض پر تفضیل اس کی تِلْكَ الرَّسُولُ بس ہے دلیل
 کلم اللہ منہم آیا ہے پایہ یوں ایک کا بڑھایا ہے
 بعد اس کے بعد عروجِ صفات رَفَعَ اللہ بعضہم درجات
 خالقِ انس و جان سنا تہے رفعتِ عز و شان دکھاتا ہے
 ملے کرم خوردہ ملے اصل: حسی ملے صحیح: ہر وہ

کہیں کسی کی طرف اشارہ ہے کون آتا خدا کا پیار ہے
 رَفَعَ اللہُ بَعْضَهُمْ کی ضمیر کس کی دکھلا رہا ہے یاں توقیر
 گر سمجھ ہے تو اس کو جانوسب حق ہے یہ حق ہے اس کو مانوسب
 فرق ہے خاص اور اخص کا یاں ہیں کلیم و حبیب کے ہی (بیٹیاں)
 طور پر ان کو دل کا کام ملا منزل نوریاں مقام ملا
 خاک کا فرش ان کا پا انداز ان سے بالائے عرش ناز و نیاز
 کُنْ تَرَانِیْ وہاں جواب آیا یاں دنوں قرب کا خطاب آیا
 قَابُ قَوْسَیْنِ سے جو کم تر ہو دوستو تم وہ وصل غور کرو
 دیکھے اور اس سے بھی بڑھ کر سند فضل شافع محشر
 سورۃ قدس آلِ عمران میں کیا بیاں ہے فضیلت شار میں
 گر شرف میں نہ تھے محمد طاق کیوں ہو اہد کس لئے میثاق
 وہ شہادت وہ قول وہ اقرار حق سے نبیوں کا تہادہ کیا اسرار
 جس کو کچھ علم کا اثر ہی نہیں اصل سے فرٹے خبر ہی نہیں
 نعتِ فہم سے جو ہو محروم کیا وہ سمجھے سرا پر مکتوم
 دخل ہوش و خرد کی نقل ہے کیا علم ہی جب نہیں تو عقل ہے کیا
 علم جس جا دکھائے اپنا زور عقل بھاگے وہاں سے جیسے چور
 علم پر سب امور کل ہے مدار عقل بے علم ہوتی ہے بے کار
 اس میں اختر بہت ہے طول کلام بس غنا کیت ملک کو تمام
 پھر سنا اک روایت صادق بہ دلیل کلام حق ، ناطق
 کچھ بیانِ فضیلت حضرت شانِ محبوبیت برصد شوکت

سننے والوں کو کہہ کے سمجھائے جلوہ نورِ حق کو دکھلائے
 یہ جو ہے اک خطابِ تامکین پُر فضیلت ہے اور شرفِ قرین
 رب سے حضرت کو از رہِ عزت عالمیں کے لئے ہے تو رحمت
 غورِ دل میں رُوحِ خدا کے لئے کمِ فضیلت ہے مصطفیٰ کے لئے
 یعنی جتنے ہوئے نبی و ولی ہیں بود و نمود تھی سب کی
 رہے پوشیدہ یا ہوئے ظاہر کوئی عالم سے تو نہ تھا باہر
 کون خارج ہے (اس سے) ہاں بولو منکرِ فضلِ منہ ذرا کھو لو
 کس کی اُمت ہو یہ تو بتلاؤ سمجھے حضرت کو یہ (تو) سمجھاؤ
 کہوئے یا نہیں یہ قرآن میں گز زمانہ خصل ہے ایمان میں
 اور بھی ہیں روایتیں ایسی جس سے ثابت ہے (شان) حضرت کی
 نہیں منظور یا ہے طولِ کلام کہ طوالتِ کلام ہے سلالِ انجام
 اس لئے بس یہ قصہ ختم کیا کلفتِ سامعینِ نذوقے لیا
 اے خدا کر کلام (میرا) قبول بہ طفیلِ رسول و آلِ رسول
 سننے والوں کو رہنمائی کر رحمت و لطفِ کسبِ ریائی کر

اخترِ اب باز آ کلام سے تو

ہو سعادتِ طلبِ سلام سے تو

السلام اے مہرِ برجِ برتری
 السلام اے رحمتِ ربِّ رحیم
 السلام اے حکمِ کُن کی ابتدا
 السلام اے ذاتِ تیری انتخاب
 السلام اے خسر و نیازِ انبیاء
 السلام اے نورِ پاکِ حقِ نما
 السلام اے مطلعِ خلقِ وجود
 السلام اے نازِ شِشِ لوحِ قلم
 ہو گیا اعصیا میں حالِ دلِ تباہ
 منہ نہیں اس کا جو کچھ (میں) کہہ سکوں
 طاعتوں سے عاری اور جاری خطا
 آپ کو روزِ شفاعت زارِ ہم (کلا)
 کس سے جزِ حضرت کروں میں عرضِ حال
 کچھ نہیں حاصل ہو اغراضِ زیاں
 اب یہی خواہش یہی ہے التجا
 بیٹے سے مطلب نہ حاجت باپ سے
 یہ تمنا ہے، نہیں ہے آرزو
 زارِ نالی کیجئے میری قبول
 صدہا بے بسی کی کب تک سہوں
 دور کیجئے دل سے میرے رنجِ یاس
 السلام اے ماہِ ادبِ سروری
 السلام اے صاحبِ خلقِ عظیم
 السلام اے فضلِ رب کی انتہا
 السلام اے باتِ تیری لاجواب
 السلام اے برگِ دمازِ اولیاء
 دستِ قدرت سے قمر کے شقِ نما
 السلام اے مقطعِ اخلاقِ وجود
 اخترِ دلِ خستہ پر چشمِ کرم
 رحم اے دونوں جہاں کے بادشاہ
 طاقت اس کی بھی نہیں جو چپے ہوں
 ہوں میں از سر تا برپا ساری خطا
 چارہ گر ہیں آپ اور بیمارِ ہم
 کہہ لوں کس کے آگے میں دستِ ہوال
 خوب دیکھی دہر کی ہنیرِ نگیاں
 عاقبت کو لے مرے فرمانِ روا
 مغفرتِ حق سے شفاعت آپ سے
 حق یہ فرماتے خود لا تقنطو
 آپ کی اُمت ہو (آخر لے رسول)
 تاجِ ناکام و پُرسرتِ رہوں
 آپ کی اُمت ہوں جاؤں کس کے پاس

اے صحیح : مطلعِ خلق اے صحیح : دیکھیں تہ زارِ نالی کیجئے میرا قبول

یا نبی اب آں اقدس کے طفیل میری بخشائش کی جانب کیجے میل
 بہر اصحابِ ضا جو حق طلب کیجئے میری حمایت پیشِ رب
 جنبشِ لب ہو دعا کے واسطے رحم بندے پر خدا کے واسطے
 مشتِ خاکِ ناتواں ہو جائے پاک تا بکے بارگنہ سے دردِ ناک
 آپ کی اُمتِ عقوبت میں رہے ظلم و جورِ نفسِ امّارہ سپہ
 نعمتِ لطف و کرم سے کیجئے سیر غلصی میں بندے کی کیا اتنی دیر
 عرضِ حال اپنا کیا اختر نے بس اک نگاہِ مہر اے فسرِ یادِ برس
 دل کو رحمتِ جان کو آرام ہو ایسی حسرت میں جو حاصلِ کام ہو
 بس خموشِ اختر یہ کیا طولِ کلام کچھ سمجھ دل میں ادب کا ہے مقام

تیرے دل کی ہو چکی حاصلِ مراد
 پڑھ درودِ پاک ارکھ خاطر کو شاد

مستزاد

سلامی..... خوشتر بہ روح پاکتِ میغبر
 جنابِ احمد رسل
 شفیع المذنبین، خیر البشر، گمراہوں کے رہبر
 جنابِ احمد رسل
 امام المرسلین، خیر البشر (اے) سرورِ عالم
 مجسمِ حمتِ یزداں
 شفیع اُمتِ غاصی، حبیبِ خالقِ اکبر
 جنابِ احمد رسل
 درودِ ان کے روانِ پاک پر ہو تو بہ تو ہر دم
 ملکہ جی گناہ کا
 لقب جن کا ہے ختم المرسلین و شفیعِ محشر
 جنابِ احمد رسل
 کہاں یہ جو صلہ لکھوں جو نعت اس شاہِ دین کی میں
 خدا مصلح ہے جن کا
 ہر اک مخلوق سے رتبے میں ہے بس افضل و برتر
 جنابِ احمد رسل

مراقبہ، مراکعبہ، مراہادی، مرا مشد
 مرا سلطان، مرا مالک، مرا سید، مرا سرور
 صلوة و صد سلام اس پر اور اس کی آل پر پہنچا
 جو ہے محبوب تیرا خاص، سب سے خوب اور بہتر
 نہ کر تو خوفِ محشر کچھ، قوی رکھ دل کو ہاں اپنے
 شفاعت عاقبت تیری کریں گے حضرت اے اختر
 خدا کا خاص پیغمبر
 جناب احمد مرسل
 خدا یا لطف سے اپنے
 جناب احمد مرسل
 خدا کے نفل و رحمت سے
 جناب احمد مرسل

غزل

لے بھی فرقت تری جس کو ستائے کیا کرے
 اچھے ہر دم شوق میں آنسو بہائے کیا کرے
 نالہ و آہ و دفغان گریہ و شور و بکا
 دست کس جس کو نہ ہو چھوئے کا دہ دامان ک
 حال جس عاشق کا ہوئے عشقِ حضرت میں برا
 بلبلی شوریدہ گلزارِ عشقِ مصطفیٰ
 ضبط رازِ عشق ہے عناق کے حق میں ضرور
 بسلی تمغہ نگاہِ ناز چشمِ دل فسریب
 حال دل لب پڑھ لائے یا نہ لائے کیا کرے
 وہ ادائے پاک جس کے جی کو بھلے کیا کرے
 خستہ پیرانہ زگر ہر دم سنائے کیا کرے
 گریز پر نہ دے گریہاں کے اڑائے کیا کرے
 وہ بھلا دل کو کہاں اپنے لگائے کیا کرے
 روضہ آفد سب میں گر بلے نہ پائے کیا کرے
 پھر جو آنسو اپنے آنکھوں میں آئے کیا کرے
 تڑپے اچھے لوٹے خوں میں جی گنوائے کیا کرے
 اشتیاق دید میں تو حالتِ اختر ہے غیر
 دیکھنے گر اس مہ انور کو پائے کیا کرے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من کلام بلاغت نظام جناب خواجہ عبدالغفار ضامنہ قلعہ

اے خدائے بندہ پروردستگیر ہیکساں
تو ہی تعالیٰ تو ہی مالک تو ہی رحمان اور رحیم
حور و غلمان و ملک سب تیری قدرت سے بنے
پھر کروڑوں رنگ کی خلقت کہیں ان کا حساب
(ایک لفظ کن سے تو نے سب کئے میں آشکار
حکم حکمت سے ترے افساد باہم متفق
تو نے جو جابا کیا جو چاہتا ہے کرتا ہے
چارہ ساز عاصیان و درد مند خستہ جہاں
تو ہی ہے پروردگار وحش و طیر و انس و جہاں
حکم سے پیدا ہوئے تیرے زمین و آسمان
ہو نہیں سکتا کسی ناطق سے ہی مطلق بیان
پر وہ حکمت میں کیا صنعت نہیں تیری نہاں
قدر قدرت سے معلق ہے تر کھفت آسمان
اور جو چاہے کرے گائے خدائے دو جہاں

قطع

تو وہ اول ہے نہ پہنچی ابتدا کو تیری عقل
تو ہی تو ہے دو جہاں میں کیجے جس جان نظر
شرح حمد پاک حضرت کیا ہو اختر سے بھلا
کون ہے تیرے سوا بس عالم الغیب اے خدا
جس قدر کھلے سب ہے جہل و نادانی مری
دل طلسم حیرت و حسرت ہے میرا کیا کروں
بندہ عاصی کی اپنے کر خدا یا مغفرت
آستانے ہی پر آیا بندہ امیدوار
تو وہ آخر ہے نہ پاوے انتہا و ہم و گماں
کوئی شے تجھ سے نہیں خالی کوئی جہا و مکاں
یہ دہان و لب کہاں احمد و ثنائی تیری کہاں
حال سبک ظاہر و باطن کلمے تجھ پر عیاں
اور جو کہتا ہوں ہشیا فی کلمے اپنی بیباں
کھول دے سب عقدے اس کے خداوند جہاں
چھوڑ کر دو کو ترے بندہ کہاں جائے کہاں؟
مت پھر انحر دم اس کو لے پناہ بے کساں

لے صحیح : کروڑوں

صدق دل سے جو دعا کرتا ہے اگر اس کو قبول
خاص لطف و رحم سے لے جبرم بخش عاصیاں
حاضر بن محفل میلاد احمد کو مدام
سائے میں اپنے کرم کے رکھو با امن و اماں
صدقے سے تیری خدائی کے خدایا درو شرب
باقی مجلس کو رکھو ہر آن ہر دم شادماں
سبم ادیا اس کا حاصل ہو (ن) اترا نفاک سے
شامل حال اس کے ہوئے خیر و خوبی ہر زمان
میرے مالک کو جس کا نام ہے عبد الغنی
عمر و جاہ و دولت اقبال سے رکھ تو اماں
اس کی سب اولاد کو اس کے عزیزوں کو خدا
تو سلامت و تاقیامت رکھو با صد عز و شان

اپنی رحمت سے تو بھرا اس اخترِ ناچیز کو
کیبھیو دونوں جہاں میں یا الہی شادماں
تمام شد

شب معراج ختم المرسلین ہے
طلوع آفتاب داد و دیں ہے
شرف میں برج خاکی کا ہے کوکب
عروج کامل ماہ زمیں ہے
قراں ہے آج مہر و مشتری کا
فروج اختر نور یقیں ہے
قدم گاہ رسول پاک ہے آج
عروج پایہ عرش بریں ہے
نشان اس کا ہے قائم ہر عرش
جو شرف خاک کا مند نشین ہے
دماغ اب آسمان پر ہے زمیں کا
کہ (طینت) مایہ سلطان دیں ہے
فرشتے مزدہ دینے کو ہیں آئے
پیام وصل رب العالمین ہے
زمین یاں نور سے معمور بکھر
دہاں آرائش عرش بریں ہے
کھلا فردوس اعلیٰ پر ہر اک در
بہ شوق آمد سلطان دیں ہے
بائیں بندی خلد بریں سب
لے رضواں گروہ تابعلین ہے
بہشتی جام شربت لے کھڑے ہیں
رواں (نہروں) میں شیر و انگبین ہے
تمنائے پرستاری میں حاضر
کھڑی ہر سمت اس جاوڑ عین ہے

فلاحی کو ادب سے ہاتھ باندھے کہیں فوج ملک، غلماں کہیں ہے
 کہیں مشتاق دیدارِ محمد صفِ ارواح جملہ سرسلیں ہے
 قدومِ احمد مرسل کا مشتاق نہیں ایسا کوئی جو واں نہیں ہے
 عجب اک شور ہے سب میں کہ آتا حبیبِ پاک ربِّ العالمین ہے
 جلی ہے کس تجمل سے سواری بیاں جس کا کہہ سکتا نہیں ہے
 ملا لنگ طر قوا گویاں جلو میں تفاد کوئی تو کوئی قریب ہے
 چلا ہے غاشیہ بکڑے سرا فیل ہلاتا مور حیل فرح الامین ہے
 ملک ہر آسماں کا کھولے در کو کھر انقش ارادت بر جبین ہے
 طبقِ داں نور کا ہر قدم پر نشاِ فرقِ پاک شاہِ دیں ہے
 اس آئیں سے غرضِ تاسدہ پہنچے جو جائے باسِ جبریل امین ہے
 رہے پھر پیچھے جو جو ساتھ تھے سب چلا آگے امام المرسلین ہے
 گیا ایسے مکاں پر رفتہ رفتہ مکاں کا کچھ نشاں جس جا نہیں ہے
 محمد اس جگہ پہنچا کہ جس جا فغلے قربِ ربِّ العالمین ہے
 نہ ہے واں زیر و بالا و پس و پیش نہ اس جا قیاس و وہم کو کچھ
 نہ بار اس جا قیاس و وہم کو کچھ حواس و ہوش سب بیکار یکسر
 خطاب آیا خدا سے میرے محبوب خطاب آیا خدا سے میرے محبوب
 قریب آؤ قریب آؤ کہ تمیرا قریب آؤ قریب آؤ کہ تمیرا
 تو میرا نور ہے، آ مجھ سے مل جا تو میرا نور ہے، آ مجھ سے مل جا
 گیا آغوشِ رحمت میں وہ آخر گیا آغوشِ رحمت میں وہ آخر
 مدارج طے ہوئے عین الیقین کے حصولِ رتبہ حق الیقین ہے

ہوا گم بحر وحدت میں وہ قطرہ
ہوا احمد احمد ایسا ہوا وصل
عجب رحمت سے فرمانے لگا تب
کہ ہاں تو مانگ لے پیائے نبی اب
جو تو جا ہے گامِ مجھ سے وہ ملے گا
ملا موقع تو حضرت نے کیا عرض
ہماری ساری اُمت ہوئے مغفور
اگر ہاں وہ گناہوں میں گرفتار
انہیں رسوا نہ کرنا روزِ محشر
مرا ہر آن اُمت کے لئے دل
یہ کہہ رو کر گرے سجدے میں حضرت

کہا تب حق نے تجھ کو لے محمد
ترے باعث کیا ایجا عالم
نہی خلقت ہی لے نور الہی
یہ عرش و کرسی و لوح و قلم سب
اگر اُمت تری عاصی ہے غم کیا
عنایت ایسی جب میری تجھ پر
تری اُمت پہ ہوگی ایسی بخشش
عطائے خاص ہوگی حسبِ بخشش
بہ مژدہ گوش کرد دنیا کی جانب
خوشی سے خندہ زیر لب نمایاں

کہ جوں عکس آئینے میں جاگزین ہے
دوئی کو واں نظر میں جا نہیں ہے
خدا جو خالقِ جاں آفرین ہے
جو کچھ مطبوع طبع نازنین ہے
تری خواہش اجابت سے قریب ہے
کہ خواہش بس یہ رب العالمین ہے
سوا اس کے تو حسرت کچھ نہیں ہے
الہی تو! تو خیر الراحمین ہے
جو اُمت میں گر وہ مذ نہیں ہے
سر اسیم ہے مضطر ہے حزیں ہے
.....

بنایا رحمت اللعالمین ہے
ترے ہی واسطے دنیا دیا ہے
اساں خلقتِ جبرخ و زمیں ہے
تری خاطر بنائے شاہِ دیر ہے
لقب تیرا شفیق المذنبین ہے
تو پھر کس واسطے اندوگہیں ہے
جو و ہم و ہم سے افزوں (تو) ہے
رضا جو تیرا رب العالمین ہے
پہل و دل خوش نبی پاک دیں ہے (کذا)
زباں پر شکر حق بل میں یقین ہے

سماں دیدار کا آنکھوں میں چھایا
جھکتا نورِ رحمت سے جیس ہے
رکھی کج سر پہ دستارِ شفاعت
جھٹی عارض پر زلفِ عنبر ہے
سرورِ امت کی بخشش کا دل میں
لبوں پر حمدِ رب العالمین ہے
نبی، اللہ نے وہ ہم کو بھیجا
جو (نوح) المرسلین، سالارِ دین ہے
خدا قرآن میں فرماتا ہے اس کو
کہ تو ہی رحمت اللعالمین ہے
یہ عالم جبکہ ہو رحمت کا اس کی
تو پھر امت کو کیا غم ہم نشین ہے
سپاسِ حق کرو سب اس خوشی میں
کہ وہ غم خوار اپنا ہے، معین ہے
زبھو لو حکم کو اس کے کبھی تم
جو اک دم ہی تمہیں بھولا نہیں ہے
طفیل اس کے سنو پھر عاقبت کو
خدا کی ہم بخشش بالیقین ہے
بس اخترِ وقتِ عرضِ حال ہے اب
کہ ساعتِ موعدا و عشرتِ قرب ہے
یہ ہے وقتِ نزولِ رحمتِ حق
وہ مطلعِ نعت میں اب پڑھ کر جس میں

غزل

محمد رحمت اللعالمین ہے
محمد ہی شفیع المذنبین ہے
براہیم و یسح و نوح و موسیٰ
کوئی رتبہ میں بس ایسا نہیں ہے
ہے دارِ اس کے دروازے کا دریاں
جم اس حضرت کا ادنیٰ خوشہ جیس ہے
نہ ہو خاتمِ رسالت کا وہ کیونکر
یہ مہر اس کی ہے، بس تیب نکلیں ہے
دکھائی اس نے ہم کو راہِ ایمان
عجب روشن چراغِ کا رخ دیں ہے
مدد دیا مصطفیٰؐ بیکس ہو بیکس
کوئی غم خوار عاصی کا نہیں ہے
ہے دل قطرہ خوں یلہ، مجھے کیا
بہر و سالے نبی پاک دیں ہے
وہ وقت بے کسی ہے اللہ اللہ
کہ کوئی مونس و ہمد ہم نہیں ہے

حمایت کا ہوں میں حضرت خواہاں کہ دشمن سخت شیطان لعین ہے
 مری تائید اس دم کیجئے آپ یہ عرض (اختر) زار و حنین ہے
 تمام شد

قطع

محفل میلادِ حضرت آج ہے سب کے دل میں تازہ فرحت آج ہے
 پھر وہی عہدِ شہر درِ قلب پھر (پھر وہی) دورِ مسرت آج ہے
 ہو گیا پھر جلوہ گر لطفِ خدا پھر وہی حق کی عنایت آج ہے
 ہیں ملائک سائے سرگرمِ طرب جوش میں خالق کی رحمت آج ہے
 جا بجا ہیں جمع خیلِ قدسیاں یاں بہارِ باغِ جنت آج ہے
 اُمتِ احمد کے دل میں ہر نفس کار سازی ہائے عشرت آج ہے
 آؤ اس جا اے گروہِ مسلمین روزِ تحویلِ سعادت آج ہے
 داخلِ محفل ہو یاں باعدادِ جس کے دل میں شوقِ خدمت آج ہے
 مانگِ خالق سے دعا پڑھ کر درود (دوستو) وقتِ اجابت آج ہے
 حاضرینِ محفلِ میلادِ پر سایہ گسترِ لطفِ حضرت آج ہے

اخترِ عاصی بھی یاں با صلہ (امید)

داخلِ بہرِ سماعت آج ہے

غزل

یا نبی کینک رہوں محضوں لقا کے واسطے خدمت میں بندے کو خدا کے واسطے
 میرا لکھوں ہو چکے ہیں نعمت دیدار سے
 اے سراپا محبت (تو) مغفرت (میں) دیر کیا
 چشمِ اقدس کا جو ہے بیمار وہ (غم) بیکر کیا
 حضرت عالی ہے وہ سرچشمہ رحمت جہاں
 سایہ حق تم تمہارا سایہ ہے امت کو بس
 (لے) چلا ہوں اس جہاں سے (مشی) سودا نبی
 ہے بہت افزوں گندے میرے الطافِ خدا
 تجھ سے حق کو چاہتا ہوں حق سے تجھ کو یا نبی
 حیف ہے ہوسے گرفتارِ عقوبت یہ قلام
 یا نبی نیچے خبر ہر دم مری (تا) درِ حشر
 جب انھیں دستِ مبارک وہ دعا کے واسطے
 حضرت عیسیٰ کی نعمت، دعا کے واسطے
 خضر میں لب نشہ عرضِ مدعا کے واسطے
 کیوں پھر میں سرگشتہ ہمِ ظلِ ہما کے واسطے
 چاہیے کیا اور بازارِ جزا کے واسطے
 اور پھر حضرت ساملیٰ التجل کے واسطے
 ہے دعا میری فقط اس مدعا کے واسطے
 آپ کی امت میں کہلا کر خطا کے واسطے
 آلِ پاک و چار یارِ باصفا کے واسطے

سلام

یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک
 یا حبیب سلام علیک صلوات اللہ علیک
 تم ہو سید تم ہو سرور تم شفیع روزِ محشر
 تم ہی ختم المرسلین ہو تم حبیبِ پاک داور
 یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک

یا حبیب سلام علیک	صلوٰۃ اللہ علیک
تم ہو حاضریٰ تم محمدؐ	تم ہو مجاہد تم محمدؐ
تم وہ (محب) ذو المنن ہو	خود کہے ہے رب اکبر
یا نبی سلام علیک	یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک	صلوٰۃ اللہ علیک
تم ہو قابل سب دعا کے	تم ہو لا (نق) سب ثناء کے
شان و رتبہ بارک اللہ	سب (۱) فضل سب برتر
یا نبی سلام علیک	یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک	صلوٰۃ اللہ علیک
تم سے دین حق میں (پایا)	تم پہ ایمان میں لایا
تم وہ خاص الخاص رب ہو	بے کسوں کے یار و یاور
یا نبی سلام علیک	یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک	صلوٰۃ اللہ علیک
پانوں غزش میں سراسر	بار عصیاں سے حال ابتر
دستگیری میر (ی) کیجیے	ہے یہ حضرت میں عرض اختر

کلام غالب کے ہنگام تراجم

عہد حاضر میں غالب اور اقبال دونوں شاعروں پر بہت کام ہوا ہے اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے تراجم بھی ہوئے ہیں غالب کا تعارف ہنگال میں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل ہی سے ہوا۔ اور جب وہ کلکتہ گئے تو اہل ہنگال میں ان کی شخصیت اور کلام سے واقفیت میں اور بھی اضافہ ہوا۔ موافقین اور مخالفین کے دو گروپ ہو گئے یہی نہیں ہنگال میں ان کے معقدوں کے علاوہ ان کے شاگرد بھی پائے جاتے ہیں تشکیل پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں اقبال کے ہنگام تراجم اکثر و بیشتر ہوئے اور کتابی صورت میں شائع کئے گئے۔ اس طرح اقبال کی مقبولیت خاص عام ہر طبقے میں ہوئی۔ غالب کا کلام نہ صرف اقبال کے مقابلے میں بلکہ ویسے بھی مشکل ہے بظاہر اسی لئے اس کے تراجم عہد پاکستان اور اس کے بعد کم ہوئے۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی امتیازی صورت نہیں برقی گئی۔ یعنی غالب کے کلام کے ہنگام تراجم ہندو اور مسلمان دونوں ادیبوں اور شاعروں نے کئے ان میں کچھ مضمون کی صورت میں اور کچھ کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہوئے، ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ ہنگالی اہل قلم کے منشور و منظوم تراجم کے ساتھ ساتھ غالب کے حالات زندگی اور کلام پر تنقیدیں بھی لکھی گئی ہیں اور ان کے فلسفیانہ خیالات اور عمیق جذبات سے بحث بھی کی ہے، اس سے اس بات ہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تفہیم غالب کے سلسلے

میں ہنگامی ادیب، اردو اہل قلم کے قریب ہیں۔ اس لئے کلام غالب کے ہنگامہ تراجم کے ساتھ ساتھ غالب کے ہنگامی مترجمین کے خیالات کا خلاصہ بھی پیش کرنا یہی مانہ ہوگا۔

سب سے پہلے میں رشید فاروقی کا تذکرہ کرتا ہوں جنہوں نے ہنگامہ ماہنامہ ”ماہ نو“ مطبوعہ ڈھاکہ اگست ۱۹۶۷ء میں ”اردو ادب اور ٹیلنٹ“ کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا اور غالب کی زندگی اور شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ غالب ایک ذہین شاعر تھے۔ ان کی شاعری نے انہیں امر بنا دیا ہے۔ ان کے خیال میں غالب کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

دورِ اول: ابتدا سے ۲۵ سال کی عمر تک، اس عہد کی شاعری میں جذبات و احساسات زیادہ ہیں۔ دیوان غالب سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ غالب کے جذبات میں اس دور کی شاعری میں فارسی زبان کا اثر زیادہ ہے کیونکہ اس زمانے میں فارسی کا اس قدر چرچا تھا کہ غالب کیا کوئی بھی شاعر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا فارسی الفاظ و محاورات کا اتنا غلبہ تھا کہ اردو بالکل فارسی آمیز ہو گئی تھی۔

دوسرے دور میں فارسی کا اثر، پہلے دور کے مقابلے میں کم ہو جاتا ہے۔ اس عہد کی زبان اور طرز بیان آسان اور سلیس ہو گیا تھا اور عام طور پر قابل فہم تھا۔ تیسرے دور میں غالب کی زبان اور اسلوب بیان اتنا بہتر ہو گیا تھا کہ غالب کو اول درجے کا شاعر سمجھا جانے لگا تھا۔

غالب کے کلام کی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے بہت سے فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہ طرزِ عمل ان کی صلاحیت سے بالاتر نہ تھا، غالب جس طرح سوچتے تھے، اسی طرح مفکرانہ انداز میں شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن ان کے اشعار تشریحی ہونے کے بجائے تخلیقی ہوتے تھے۔ ان کی شاعری میں فلسفہ ہے، انہوں نے کبھی عام انداز میں یا مختصر جملے پر زندگی کا جائزہ لینے کی کوشش نہ کی۔

جہاں تک انسانیت اور اس کی عظمت کا تعلق ہے، وہ انسان کو دل سے پسند کرتے
 تھے۔ رشید فاروقی کے منظر تراجم اب پیش کئے جاتے ہیں۔ انہیں سماعت فرماتے وقت
 اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اصل مفہوم سے کس قدر قریب ہیں۔ زبان بہت سیدھی
 سادی استعمال کی گئی ہے۔ اور انداز بیان میں سادگی ہے۔ جسے ہندی سمجھنے والا
 بلا تکلف آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

(۱) ہیں اور بھی دنیا میں سمخو رہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

प्रति प्रति	आदि आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
prithi prithi	adi adi	adi	adi	adi	adi	adi
प्रति प्रति	आदि आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
prithi prithi	adi adi	adi	adi	adi	adi	adi

(۲) رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی بڑی ہیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi
आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi

आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi
आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi

(۳) ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج

میں عندلیب گلشنِ نازِ فرید ہوں

आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi
आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi

(۴) ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

یا الہی یہ ما جسد کیا ہے

आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi
आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि	आदि
adi	adi	adi	adi	adi	adi	adi

(۵) میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

فارسی	عربی	ہندی	انگریزی	فارسی	عربی	فارسی	فارسی
کاش	کاش	kash	ask	کاش	کاش	کاش	کاش
کاش	کاش	kash	ask	کاش	کاش	کاش	کاش

(۶) عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا

درد کی دوا پائی، درد بے دوا پائی

فارسی	عربی	ہندی	انگریزی	فارسی	عربی	فارسی	فارسی
عشق	عشق	ishq	love	عشق	عشق	عشق	عشق
عشق	عشق	ishq	love	عشق	عشق	عشق	عشق

(۷) آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد

مجھ سے مرے گز کا حساب اے خدا مانگ

فارسی	عربی	ہندی	انگریزی	فارسی	عربی	فارسی	فارسی
عشق	عشق	ishq	love	عشق	عشق	عشق	عشق
عشق	عشق	ishq	love	عشق	عشق	عشق	عشق

چھٹے شعر کے پہلے مصرع میں مترجم نے ”طبیعت“ کا ترجمہ درست نہیں کیا، اس کا متبادل ”انی“ ہے (نشان کشیدہ) کیا ہے جس سے صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا اسی طرح پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں زبان کا ترجمہ نہ ہو سکا۔ منہ کھلا ہوا رکھنے سے زبان کا مفہوم پورا نہیں ہوتا۔

دوسری شخصیت ابوسعید ایوب کی ہے جنہوں نے غزلیات غالب کا انتخاب تعارفی اور تنقیدی مقدمے کے ساتھ کتابی صورت میں ڈے پبلشنگ، کلکتہ سے جنوری ۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔ جناب ابوسعید کی مادری زبان اردو ہے لیکن بنگلہ زبان میں انہوں نے منفرد ذہنی دستگاہ حاصل کر لی کہ سرزمینِ بنگال میں فلسفہ اور رنگ ادب خصوصاً

میگو پر درِ استاد کی حیثیت رکھتے ہیں غالب کی طرف ان کی توجہ یقیناً ایک فال نمیک ہے۔
 کیونکہ عام نیرنگی طبقہ اور بائیں بازو کے ادیب ان کے ترجمہ کی طرف خصوصیت متوجہ
 ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ غالب کے منتخب اشعار کا ترجمہ ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے
 انتخاب کرنے کا ارادہ تھا، لیکن غزل میں یہ کام مشکل ہے کیونکہ شاعر کے مختلف محانات
 و میلانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اشعار کو ایک ہی لڑی میں پرونا دشوار ہے غزل
 جاپانی ہائیکو سے ملتی جلتی ہوتی ہے، لیکن اس سے طویل غزل میں کہے کہم الفاظ کے
 وسیلے سے شاعر اپنے خیالات و احساسات کو بیان کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فنی خوبیوں
 کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ انہوں نے لفظی ترجمے سے احتراز کیا ہے تاکہ اصل مطلب واضح
 ہو سکے۔ مترجم اگر قادر الکلام شاعر ہو تو شعر کا ترجمہ بہتر طور پر کر سکتا ہے، ہاں اس میں
 شک نہیں کہ منظوم ترجمے کو اصل مفہوم سے قریب تر لانے میں دشواری ہوتی ہے۔
 بہر صورت منشور ترجمے میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ ہر نالی کو اردو شعری
 دل کشی اور شاعری کی روح سے روشناس کیا جائے تاکہ غالب کے فکر و فن اور شاعرانہ
 اہمیت کا اندازہ لگ سکے۔ ابو سعید الیوب نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ بعض جگہ
 غالب کی مخصوص ترکیبوں اور دلکش استعاروں کے متبادل بنکلا الفاظ نہ ملنے کے
 باعث انہیں آزاد ترجمہ کرنا پڑا ہے۔ تاکہ شاعر کے شعری احساسات جذبات اور
 نازک خیالات کو قاری کے ذہن تک صحیح طور پر منتقل کیا جاسکے۔ غالب اردو کے
 مشکل گو شاعر ہیں انہوں نے بعض ایسے اشعار کہے ہیں جو سمجھ میں نہیں آتے لیکن بہت
 سارے آسان شعر بھی کہے ہیں، بعض ایسے اشعار کہے ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں ذہنی پر
 زور دینا پڑتا ہے۔ لیکن غالب کے پر سکواہ الفاظ اور دلکش انداز بیان سے متاثر
 ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ غالب کی شاعری ان کی شخصیت کے ارد گرد گھومتی ہے۔
 یعنی اپنے شخصی رنج و غم کا اظہار اپنی شاعری میں کرتے ہیں جسے ناقابل اعتنا نہیں

سمجھا جاسکتا غائب نے جہاں اپنے غم و الم کا تذکرہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا غم ان کے شعریں جھلکتا نظر آتا ہے :

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نقادوں کا خیال ہے کہ اردو میں دو ہی بڑے شاعر گزرے ہیں، ایک غالب دوسرے اقبال دونوں کا نقطہ نظر اور انداز فکر اگرچہ مختلف ہے لیکن بعض امور میں مماثلت ہے۔ مثلاً دونوں کا بیشتر کلام فارسی میں ہے اور دونوں نے پسندیدہ مضامین فارسی ہی میں ضبط کئے ہیں۔ غالب نے ۱۶/۱۵ سال کی عمر سے اردو میں شعر گوئی شروع کی اور ۳۰ سے ۵۰ سال کی عمر تک فارسی زبان میں شعر کہے۔ جب غالب بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے تو انہیں سرکاری خطاب سے نوازا گیا۔ غالب نے ابتدائی اور آخری دور میں جو شعر کہے ان کی زبان بیان اور لب و لہجہ میں خاصا فرق ہے لیکن فارسی الفاظ کا استعمال ان کے یہاں بدستور جاری رہا اور فارسی طرز کلام کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اب ابوسعید اویسی کے ہنگام تراجم سے مثالیں پیش ہیں

(۱) ہم نے دشت کدہ بزم جہاں میں جوں شمع

شعلہ عشق کو اپنا سرو سامان سمجھا

ہم نے	دشت	کدہ	بزم	جہاں	میں	جوں	شمع
ham ne	deh	kah	bezm	jahan	mein	joon	sham
ham ne	deh	kah	bezm	jahan	mein	joon	sham
ham ne	deh	kah	bezm	jahan	mein	joon	sham

(۲) یہ فتنہ آدمی کی خدادید رانی کو کیا کم ہے ؟

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو ؟

یہ	فتنہ	آدمی	کی	خدا	دید	رانی	کو	کیا	کم	ہے
ye	fitnah	adami	ki	khuda	deed	raani	ko	kiya	kam	hai
ye	fitnah	adami	ki	khuda	deed	raani	ko	kiya	kam	hai
ye	fitnah	adami	ki	khuda	deed	raani	ko	kiya	kam	hai

ہیڈ	ہاٹ	کھڑ	تول	آراخان	آراہٹ	کارو
Haid	Hot	Khar	Tol	Arakh	Arah	Karo
		کھڑ	تول	آراہٹ	آراہٹ	کارو
		Khar	Tol	Arah	Arah	Karo

(۳) خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو ہزار ابر آئے
بجھتا ہوں کہ ڈھونڈ ہے ابھی سے برق خرمس کو

کھڑ	کھ	آراہٹ	تول	کھڑ	کھڑ	کھڑ
Khar	K	Arah	Tol	Khar	Khar	Khar
		آراہٹ	تول	کھڑ	کھڑ	کھڑ
		Arah	Tol	Khar	Khar	Khar

کھڑ	کھ	آراہٹ	تول	کھڑ	کھڑ
Khar	K	Arah	Tol	Khar	Khar
		آراہٹ	تول	کھڑ	کھڑ
		Arah	Tol	Khar	Khar

(۴) ہم کہاں کے دانے تھے کس ہنرمیں بکتا تھے
بے سبب ہو اغالب، دشمن آسماں اپنا

کھڑ	کھ	آراہٹ	تول	کھڑ	کھڑ	کھڑ
Khar	K	Arah	Tol	Khar	Khar	Khar
		آراہٹ	تول	کھڑ	کھڑ	کھڑ
		Arah	Tol	Khar	Khar	Khar

کھڑ	کھ	آراہٹ	تول	کھڑ	کھڑ
Khar	K	Arah	Tol	Khar	Khar
		آراہٹ	تول	کھڑ	کھڑ
		Arah	Tol	Khar	Khar

(۵) بے دار عشق سے نہیں ڈرتا سگہ اسد

جس دل پر ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

کھڑ	کھڑ	کھڑ	کھڑ	کھڑ	کھڑ
Khar	Khar	Khar	Khar	Khar	Khar

کھڑ	کھڑ	کھڑ	کھڑ	کھڑ	کھڑ
Khar	Khar	Khar	Khar	Khar	Khar

(۶) وہ فران اور وہ سال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

م	سن	میا	ع	فصل	تاریخ :
جای	سال	آ	جای	پہن چلا، ع	تاریخ :
ع	سن	میا	ع	فصل	تاریخ :
جای	سال	میا	ع	فصل	تاریخ :

کلام غالب کے تیسرے مترجم جناب منیر الدین یوسف ہیں جن کا خاندانہ خالص ہے لیکن ان کے یہاں ابتدا سے اردو پڑھنے بولنے اور لکھنے کا چلن تھا ان کے چچا جناب محمود الرب صدیقی 'خالد ہنگالی کے نام سے نقاد (آگرہ) میں غزلیں اور نظمیں لکھا کرتے تھے اور نظام شاہ دکن سے ان کے مخلصانہ اردوستانہ تعلقات تھے گویا اس طرح انہیں اردو ورثے میں ملی، انگریزی کے علاوہ اردو، ہنگال اور فارسی پر یکساں رکھتے تھے انہوں نے ہنگال زبان میں تاریخ ادب اردو ۱۹۶۸ء میں مرتب کر کے ہنگال کیڈمی سے شائع کرائی اور غالب کی پچاس منتخب غزلوں کا منظوم ترجمہ دیوان غالب کے نام سے کیا۔ جسے اسلامک فاؤنڈیشن ڈھاکہ نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۸۰ء میرے پیش نظر ہے۔

وہ غالب کی شاعری پر اہل ہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب 'میر اور سودا کی شاعرانہ روایت میں انقلاب برپا کیا۔ ان کا تعلق کلاسیکی و ہندو شاعری سے تھا لیکن ان کی طبیعت میں جدت طرازی تھی۔ ان کی وفات پر ایک صدی گزر جانے کے بعد ان کی شاعرانہ عظمت برقرار رہی۔ انہوں نے اپنے کلام میں انیسویں صدی کے مسلم تمدن اور معاشرے کی بد حالی کی عکاسی کی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے ایک طرف مٹی ہوئی تہذیب کا نظارہ کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ان کا کلام اپنے دور کی تصویر بھی ہے اور مستقبل کی بشارت بھی۔ اس لئے غالب کے دور کو اردو شاعری کا نشاۃ ثانیہ کہنا مناسب نہ ہوگا۔ ہنگال میں غالب کے معاصر مدعو سیدون تھے لیکن انہوں نے طویل نظمیں لکھی ہیں۔ اس لئے ان دونوں میں کوئی قدر

غالب کے یہاں جوئے خوں کی ترکیب کا ترجمہ آنکھی چل دھڑا کیا گیا ہے جو درست نہیں یعنی اشک چشم یوں کہا جاسکتا تھا "آنکھی ہوتے رو کثیر دھارائے"
 (۳) نیند اس کہ ہے دماغ اس کا لائیں اس کی ہیں
 تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

गुह्य	ज	गिर	गिर	त	गिर	गिर	गिर	गिर
Guhya	Je	Gir	Gir	Te	Gir	Gir	Gir	Gir
गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर
Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir

پہلے مصرعے میں مترجم نے غالب کے مفہوم کو دو بالا کر دیا ہے یعنی دوسرے
 ٹکڑے میں دماغ کا ترجمہ خواب کیا ہے اور ظاہر ہے کہ نیند کے بعد خواب ہی کی توقع ہے
 دوسرے مصرعے میں "اوگو مون" یعنی اے دل، قافیے کی ضرورت کی وجہ سے فاضل
 لایا گیا ہے۔

(۴) جلوہ گل نے کیا تھا، داں چسراغاں آپ جو
 یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर
Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir
गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर
Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir

(منشور تراجم)

(۵) بلبل چھمت دجہ سیہ مستی ار باب چمن
 سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب

गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर
Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir
गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर	गिर
Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir	Gir

(۶) ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب

o	वर्षा	अव	अ	लीप	म
Sy	Varsha	Don	Ek	Lehman	Je
मर	वर्षा	मर	मर	मर	मर
Tar	Varsha	Mar	Jodi	Qatlon	Maral
		Kere	Days	Jaye	
मर	मर	मर	मर	मर	मर
Tare	Tare	Amharan	Mar	Kichu	Sey

(۷) خزاں کیا بہ فصل گل کہتے ہیں کس کو بہ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

ख़ा	हि	वसु	कु	मर	म
Khaw	Ki	Wason	Ku	Mar	M
ख़ा	हि	वसु	कु	मर	म
Khaw	Ki	Wason	Ku	Mar	M
ख़ा	हि	वसु	कु	मर	म
Khaw	Ki	Wason	Ku	Mar	M
ख़ा	हि	वसु	कु	मर	म
Khaw	Ki	Wason	Ku	Mar	M

(۸) نقش فریادی ہے کس کی شوخی، تحریر کا
کاغذی ہے پر، ہر پیکر تصویر کا

नक्श	फ्री	कस	कु	मर	म
Naksh	Frei	Kas	Ku	Mar	M
नक्श	फ्री	कस	कु	मर	म
Naksh	Frei	Kas	Ku	Mar	M
नक्श	फ्री	कस	कु	मर	म
Naksh	Frei	Kas	Ku	Mar	M
नक्श	फ्री	कस	कु	मर	म
Naksh	Frei	Kas	Ku	Mar	M

غالب کے فکر و فن کا تجزیہ

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم ہستلاؤں گے کیا ؟

غالب کون اور کیا تھے ؟ اس امرہ جائزہ لینے کے لئے ابتداً مقدمہ فرض ہے کہ پہلے غالب کی شخصیت کا جائزہ لے، اس کے بعد شخصیت کے ایسے جز ان کے فکر و فن کے حدود و خال کو واضح کرنے کی کوشش کرے۔ انسانی شخصیت کی تعبیر میں دو عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ ایک مزاج اور دوسرا ذہن۔ غالب مزاج کے اعتبار سے خود دار و خود پسند تھے۔ اور فکری لحاظ سے بام شریا سے ہم آغوش و ہم کنار۔ غالب نے مسلم معاشرے کے عروج و ارتقاء کی داستانیں اپنے کالوں سے سنیں اور انگریز سرکار کے تصرف و تسلط کی عبرتناک تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اچھے دن ہی دیکھے اور برے دن بھی سہے۔ لیکن ان کے طبعی میدان در فطری رجحان میں کوئی فرق نہ آیا۔ فقر و فاقہ میں فخر محسوس کیا۔ اور بے نیاز و دوسخ داری کو اپنا کردار جانا۔ انہیں خاندانی برتری کا احساس تھا۔ ان کی خود بینی و خود پسندی نے زمانے کے آگے انہیں سر تسلیم خم کرنے سے بچالیا۔ ان کے نزدیک خود بینی سمجھیت کا وہ عنصر ہے جو بندگی اور غلامی میں بھی انسان کو آزاد رکھ سکتا ہے۔ اور اسیری و گرفتاری کی کندہ اسے اپنے دام میں نہیں لاسکتی۔ غالب کی

شخصیت کا یہ پہلو ان کے شعر میں برہنہ کمال جلوہ گر ہے، کہتے ہیں

ہندگی میں بھی وہ آزادہ فہم ہیں کہ ہم : اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وہاں نہ ہوا
آغازِ شاعری میں غالب نے ظہوری و تبدیل کی تقلید کی اور اس کے زیرِ اثر
اپنے کلام میں دور از کار تشبیہات اور نئی نئی ترکیبات استعمال کیں، غبارِ شہرِ خود داری
ساحل اور موجِ سنگار جیسے مرکبات کا استعمال ان کی قوتِ اختراع کی اچھی مثالیں ہیں
ان کی انانیت اور خود پسندی کی یہ بار فرنی ہے شباب تک رہی۔ اس کے بعد غالب کی
اردو شاعری میں تبدیلی یا تقلیدِ تبدیل کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ کیونکہ خود انہیں تبدیل
کی مشکل پسندی حوصلہ آزما ہی نہیں قیامت بھی نظر آئی جس کا اعتراف اس شعر میں
کیا ہے ۔ طرزِ تبدیل میں یہ نکتہ لہنا : اسد اللہ خاں قیامت ہے

لیکن یہ تقلید دراصل ان کی شخصیت کے منافی ہے۔ انہوں نے روایت پرستی
سے بغاوت کی اور جدت پسندی کو اپنا شیخ نظر قرار دیا۔ بے فن میں خونِ جگر سے
رنگ آمیزی کی اور اسے فکر کی بلندی سے آشنا کیا۔ ان کے اندازِ فکر نے ایک نئے فن کی تلاش کی
ان کے اسلوب بیان نے اردو شاعری کو ایک نیا لبِ لہجہ عطا کیا۔ تشبیہات و
استعارات نے ان کے اندازِ زندگی کی رفق بخشی۔ یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں غالب محبوب
کے جلوہ سیمائی کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ آئینہ بھی اس کے سامنے ذرہ ہائے
ناک کی طرح پر افشاں ہونے لگتے ہیں ۔

یہ کس ناہید کی مثال کہ ہے جلوہ سیمائی
کہ مثلِ ذرہ ہاں ہی ناک آئینہ پر افشاں

بہادشاہ ظفر کے زمانے میں ذوق کی درباری مقبولیت و اہمیت کے پیش
نظر ان کے کلام سے غالب بھی متاثر ہوئے۔ لیکن ذوق کے مقابلے میں وہ مقدارِ کلام کو
معیارِ کلام اور حسنِ شاعری نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے نزدیک شعر کی عظمت اس کی لطافت

اور کیفیت میں مضمر ہوتی ہے۔ ”خطوطِ غالب“ میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

”شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں“

اس معنی آفرینی اور تخلیقی قوت کی ایک مثال ذیل کے شعر میں بہت واضح طور

پر ملتی ہے، غالب فرماتے ہیں :-

فروغِ شعلہ خس یک نفس ہے : ہوس کو پاس ناموس و فاکیا

شاعر نے عشق و ہوس اور پائنداری و ناپائنداری کا تقابلی مطالعہ کس بلاغت و لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ”ہوس“ کو ”فروغِ شعلہ“ سے تعبیر کرنا جو ایک لمحے میں نکون کی طرح بھڑک کر بجھ جاتی ہے، لیکن دیر پا ثبات نہیں ہوتی۔ ناموس و فاداری کے خلاف سمجھنا عین ثباتِ عشق کے مطابق ہے۔ عشق کی پائنداری تو دراصل ونا سے عبارت ہے۔ اسی موضوع پر غالب کا دوسرا شعر پیش کیا جاتا ہے جس میں شاعر نے وفاداری کو صحیح معنوں میں ایمان و یقین قرار دیا ہے اور اس شرط کے ساتھ ساتھ مسلم و غیر مسلم کا امتیاز تک باقی نہ رکھا، کہتے ہیں :-

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے

مرے بچانے میں تو کبھی میں گاڑو برہمن کو

غالب کے فن کی انفرادیت اور فکر کی عظمت سے انکار، اردو شاعری کی عظمت

اور انفرادیت سے انکار کے مترادف ہے۔ ان کی زبان کی دلکشی، طرزِ ادا کی سحر آفرینی، خیال

کی برجستگی، فارسی ترکیب اور اردو محاورے کا بر محل استعمال ملاحظہ ہو :-

دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقشِ پا :- موجِ خسرام یا رہی کیا گل کتر گئی

غالب نے فکر و فن کی دنیا میں جو انقلاب پیدا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے

اس سے پہلے اردو شاعری کا دامن احساسات و جذبات سے معمور تھا لیکن اس میں

فکر و نظر کی وہ بلندی نہ تھی جو اسے غالب نے عطا کی۔ میر نے اردو شاعری کو سپردگی و

دار فتنگی بخشی اور غالب نے بخود دی و خود داری، میر نے اسے سادگی و سلاست سے آشنا کیا۔ اور غالب نے وقت پسندی و جدت پسندی سے، میر دل کی دنیا میں محو تھے۔ ان کا فن ان کی آپ بیتی سے عبارت ہے۔ لیکن غالب نے دل کی دنیا سے نکل کر وسعتِ آفاق کا مطالعہ کیا اور اس کا سنات رنگ و بو کی داستان کو فکر و نظر کے قالب میں پیش کیا۔ غالب صرف ایک شاعر نہیں اپنے عہد کے ترجمان بھی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے نتیجے کے طور پر ان کے کلام میں دہلی کے معاشرے کی زوال آمادہ جھلک اور سماجی انحطاط کا احساس بہت نمایاں ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں جو خود زبانِ حال سے اپنے ماحول کی ابتری و بد حالی کی کہانی کہہ رہے ہیں۔

بوئے گل 'نالہ دل'، رو و درِ جہانِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے

اُردو شاعری، خصوصاً غزل کا محبوب موضوعِ عشق ہے۔ غالب نے روایتی

عشق و محبت کے معیار سے بلند ہو کر غزل میں اجتہادی شان پیدا کی، اس میں تصور

پرستی کے بجائے حقیقت پسندی کو رواج دیا۔ عاشق کو بیچارگی کی جگہ خود داری اور

سوانحی کے بجائے وضع داری کے اصول پر کار بند کیا۔ وہ محبوب کی خوشنودی کے لئے اپنی

غیرت کا سودا نہیں کرتے۔ وہ عشق بھی کرتے ہیں اور عزتِ نفس کا دامن بھی ہاتھ سے

نہیں جانے دیتے۔ ان کے نزدیک عشق میں فریاد کرنا باعثِ رسوائی ہے کیونکہ جب دل کا

پہلو میں نہیں تو لبِ کشف سے فائدہ ہے، فرماتے ہیں:

کسی کو دے کے دل کوئی ذریعہِ نفع کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو بھر من میں نہاں کیوں ہو

ان کے غمگدہ عیش میں سوزِ دروں، آتشِ سیال کی طرح موج زن ہے۔ ان کے خیال کی رعنائیِ محراب کے تصور کا عطیہ ہے۔ حریتِ موبائی کی طرح ان کی شاعری جسا لیاقت پہلو کی رہن منت نہیں۔ وہ محبوب کے حسنِ جمال سے لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس میں جلال کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ شیوہ عاشقی سے وہ بخوبی واقف ہیں اور عشق میں آہِ دزاری سے بھی مبرا نہیں۔ لیکن اپنی جدت پسند طبیعت اور طرزِ بیان کی انفرادیت سے کام لے کر عشق میں شکوہ بیدار کے بجائے تقاضے جفا کے لئے "نالہ و فریاد" کو "حسنِ طلب سے تعبیر کرتے ہیں۔

نالہ جز حسن طلباے ستم ایجا رہیں

ہے تقاضاے جفا، شکوہ بیدار نہیں

غالب اپنے فارسی کلام کو "نقشِ ماے رنگ رنگ" کا ایک حسین و غطرز گلدستہ سمجھتے ہیں اور اس پر انہیں فخر و ناز بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے فارسی کلام کی مقدار جہاں اردو کلام کی بد نسبت پانچ گونہ زیادہ ہے۔ وہاں لطیف احصاات اور بارز تخیلات کے باعث اردو کے مقابلے میں فارسی کلام کہیں زیادہ ممتاز اور اعلیٰ معیار و افکار کا حامل ہے۔ اس کے برعکس غالب اپنی اردو شاعری کو بے رنگ و روغن جانتے ہیں، لیکن اسے زمانے کی ستم ظریفی کہیے یا ان کے کلام کی طرف ذکاوری کہ غالب کو جو شہرت ان کے اردو کلام کی بنا پر نصیب ہوئی وہ فارسی کلام کی بدولت میسر نہ ہو سکی۔ اس کا سبب بہت واضح ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی وجہ سے فارسی زبان کی پہلی سی قدر و منزلت باقی نہ تھی اس لئے غالب کی فارسی شاعری کی اہمیت و عظمت کی بنا پر ان کی سرپرستی کو نہ کرنا جبکہ فارسی نامک کی زبان تھی نہ قوم کی۔ غالب کی عدم شہرت کا ایک سبب آپ اسے بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ لگا کے لئے ثبوت کے طور پر اس امر کا تذکرہ سبب نہ ہو گا کہ خود غالب کی زندگی میں ان کے فارسی

کلام کی اشاعت صرف دوبارہ اور دو کلام کی اشاعت پانچ بار ہوئی۔

غالب نے فکر و خیال اور زاویہ نظر کے کیسے کیسے جادو جگائے ہیں۔ اس کا اندازہ آپ اسی وقت لگا سکتے ہیں جب ان کے گلستانِ شعر و سخن کی سیر کریں۔ اور دل و نگاہ کو دہلیزِ فکر و نظر دیں۔ ”بادِ بہاری“ کو ”آئینہ“ کہنا اور چین کے سرسبز و شاداب پودوں کو ”زنگار“ سے تعبیر کرنا غالب کے تخلیقی ذہن کا کمال نہیں تو اور کیا ہے؟ ”کشف“ اور ”لطف“ دونوں ایک دوسرے کے اثبات کے لئے لازمی جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ جلوہ افرونی کا مشاہدہ و منظر ہر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک لطافت اور کشفیت دونوں یکجا نہ ہوں۔ ایک کو امتیازی حیثیت بخشنے کے لئے دوسرے کی موجودگی ضروری ہے جس طرح دن کے بغیر رات کا تصور ناممکن ہے۔ مادی اور غیر مادی اشیاء کے تصور سے غالب نے جس حقیقت کا انکشاف کیا ہے وہ جدید سائنسی نقطہ نظر کے عین مطابق ہے / فرماتے ہیں۔

اطافت بے کشفیت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

غالب کے خیال کی زنگار نگہی صرف ان کی شاعرانہ فن کاری تک محدود نہیں بلکہ وہ فکر کی راہ سے فلسفہ و تصوف کی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں اور یہاں بھی اپنی جدتِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ عقیدہ وحدت الوجود کے متعلق فلسفہ و شعر کے امتزاج سے ذیل کے شعر میں کیا لطیف اہام پیدا کیا ہے مگر اس کے دوش بہ دوش خدا کی وحدانیت کا اعتراف بھی اس میں موجود ہے۔ کہتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈوبو یا جمھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف ”کہا ہے۔ ان کا یہ خیال کس قدر حقیقت سدانہ ہے کہ غالب کی نظم ہو یا نثر ہر جگہ ان کی ظرافت کے متنوع گل بوٹے نظر آتے ہیں۔

اور ان کے طنز و مزاح کی چاشنی لطف دے جاتی ہے۔ غالب کے کلام میں اس کی مثالیں
بآسانی مل جاتی ہیں۔ واعظ پر طنز کا یہ پہلو ملاحظہ ہو۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نیکے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ غالب نے مے نوشی و بادہ خواری سے اپنے دامن کو
کچھ اس طرح آلودہ کر لیا کہ مسائل تصوف کے بیان کے باوجود زہد و تقویٰ کی ولایت کے
دائرے میں داخل نہ ہو سکے۔ خود فرماتے ہیں۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
مجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ تھا غالب کے فکر و فن کا مختصر سا جائزہ جو پیش کیا گیا۔ غالب کی عظمت و ابدان
اور ان کی مقبولیت از دوال ان کا کلام ان کی شخصیت کا ترجمان ہے اور ان کی شخصیت
ان کے فکر و فن کی عکاس !



- نام: محمد کلیم (کلیم سسرچی)
- پیدائش: ۱۲ جنوری ۱۹۳۶ء
- جائے پیدائش: سسرچم، ضلع ریتاس، بہار (ہندوستان)
- تعلیم: بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے (اردو)
- : ایم۔ اے (فارسی) ڈھاکہ یونیورسٹی
- : ڈی۔ لٹ (تہران یونیورسٹی)
- ڈپلوما: قدیم فارسی، اوستا، پهلوی (تہران)
- پیشہ: پروفیسر شعبہ السنہ (راجشاہی یونیورسٹی)
- صدر شعبہ: (۱۹۷۶ - ۱۹۷۹ء)
- (۱۹۸۲ - ۱۹۸۵ء)
- اعزاز: (۱) صدر پاکستان (انعام خصوصی) ۱۹۵۹ء
- (۲) صدر پاکستان (یادگار اقبال طلائی تمغہ) ۱۹۷۹ء
- ادبی سفر: ایران، پاکستان اور ہندوستان کے علمی ادارے
- سیمیناروں میں شرکت۔
- تصانیف (مطبوعہ): (۱) بیمار بلبل (۲) روایت و درایت
- (۳) بنگال میں غالب شناسی
- نیر طبع: اردو کے بنگالی شعراء، (۲) ارمغان بنگا
- (۳) بنگال میں اسلامی تصوف (۴) مطالعہ و محاسن
- (۵) فرہنگ طلائی (انگریزی)، (۶) مخزن فارسی و بنگالی
- (فارسی) (۷) شعری مجموعہ۔
- نیر ترتیب: (۱) دبستان شاد (۲) ادب و احتساب
- (۳) گنجینہ دانش (۴) تذکرۃ المعاصرين
- پستا: ڈپلو۔ ۷۷/۱، یونیورسٹی کمپس راجشاہی (بنگلادیش)